عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ

طلوعِ اسلام

نومبر ۱۹۳۹

ایک روپیہ

ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کی عدیم النظیر کتاب

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

کی طباعت مکمل ہو چکی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ اب اس کی جلد سازی اور متعلقات باقی ہیں۔ اندازہ ہے کہ وسط نومبر تک کتاب شائع ہو جائے گی۔

اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدائی مقدمہ وغیرہ کے قریب پچاس صفحات اس کے علاوہ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ ۳۰ پونڈ کا دبیز۔

جلد پاکیزہ اور مضبوط۔

گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔

ٹائیٹل اور ہر باب کے عنوانات حسین و رنگین۔

جدول میں جناب چغتائی کی بے مثال فن کاری۔

جلی قلم میں جناب یوسف دہلوی کی عدیم النظیر جواہر ریزی۔

متن کتاب قرآنی آئینہ میں تذکار جلیلہ حضور سرور کائنات علیہ التحیۃ والسلام سے کوثر فشاں

قیمت فی جلد بیس روپیہ ـــــ محصول ڈاک اور پیکنگ اڑھائی روپیہ

اگر کتاب بذریعہ ریل منگائی جائے تو اس میں کرایہ کی کفایت ہوگی۔

معارف القرآن کی پہلی تین جلدیں، تھوڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مکمل سیٹ (ہر چہار جلدوں) کی قیمت ۵۵/- روپیہ۔

اگر آپ جلد چہارم کے لئے فرمائش بھیج چکے ہیں تو اب قیمت بھیج دیجئے۔ چیک بھیجئے تو آپ کو کفایت رہے گی ـــــ اگر آپ نے ابھی تک فرمائش نہیں بھیجی تو جلدی کیجئے ـــــ اگر آپ ایجنسی لینا چاہتے ہیں تو شرائط معلوم کیجئے۔ والسلام

جے۔ بی۔ عارف
پبلشر معارف القرآن
رابسن روڈ۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

مرتّب	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
محمد یونس	ایک روپیہ	سالانہ دس روپے
		ششماہی چھ روپے

جلد ۲	نومبر ۱۹۴۹ء	نمبر ۱۱

فہرست مضامین

لمعات	۳ - ۷	باب المراسلات	۴۵ - ۵۶
بقیہ لمعات	۷۷ - ۷۸	(۱) تعددِ ازواج	
کچھ اپنے متعلق	۸ - ۱۶	(۲) شرعی سزائیں	
مسلمان کی زندگی		رفتارِ عالم	۵۷ - ۷۵
(محترم پرویز صاحب)	۱۸ - ۳۲	بوقلمونیاں (نظم)	۷۶
وضعِ حدیث		(محترم اسد ملتانی)	
(علامہ اسلم جیراجپوری)	۳۳ - ۴۴		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

لاہور کے ایک موقر جریدہ نے اپنی ۱۶ر اکتوبر کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ لکھا ہے۔

طلوع اسلام کراچی ایک خالص دینی پرچہ ہے جس میں زیادہ تر دینی مباحث ہی پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس ماہنامے کا کمیونسٹ خیال والوں سے دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ یہ اپنے مقاصد اور اصول کے اعتبار سے کمیونزم کا سخت ترین مخالف ہے۔ طلوع اسلام نے اپنی تازہ اشاعت میں انسانی زندگی میں معاشیات کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

جس قوم نے اپنا معاشی مسئلہ حل نہیں کیا، فطرت کے اٹل قوانین نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔

معاصر موصوف کے نزدیک معاشی مسئلے کے صحیح حل کیلئے ضروری ہے کہ مملکت کے ہر متنفس کی لابدی ضروریات اس طرح پوری ہوتی رہیں کہ وہ ہر فرد کیلئے موجبات اور موید توانائی ہوں۔ آگے چل کر مزید طلوع اسلام لکھتے ہیں،

معاشی نظام کی صلاحیت دین مبین کا ایک اہم بازو ہے

"۔۔۔ کو اسلام سے دشمنی کا طعنہ دینے والوں کو "طلوع اسلام" کے ان فقروں پر غور کرنا چاہیے واقعہ یہ ہے کہ آج اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ لوگ جو اسلام کا نام لیکر خدا کی غریب مخلوق پر ظلم کرتے اور ان کو بھوکا رکھ کر خود داد عیش دیتے ہیں، ان کو اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ انصاف کرنے پر مجبور کیا جائے، اور ان سے ان غریبوں کو ان کا حق دلوایا جائے۔ خدانخواستہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ڈر ہے کہ دیگر مذاہب کی طرح کہیں اسلام بھی بدنام نہ ہو جائے، اور لوگ سرمایہ داری کیلئے اپنا آلۂ کار نہ بنا لیں اور اس کا بھی وہی حشر نہ ہو، جو یورپ میں عیسائیت کا ہوا۔

عام حالات میں ایک معاصر کی طرف سے اس قسم کا حسنِ اعتراف طلوع اسلام کیلئے وجۂ مسرت ہونا چاہیے تھا لیکن ہمارے لئے یہ شذرہ باعثِ تعجب بھی ہوا اور وجۂ تاسف بھی۔ تعجب اس لئے کہ کیا ہمارے اس معاصر کو، جو سال بھر سے زیادہ عرصے سے شائع ہو رہا ہے طلوع اسلام میں معاشیات سے متعلق پہلی مرتبہ کوئی مضمون نظر آیا ہے۔ اگر طلوع اسلام کے دور سابقہ سے قطع نظر بھی کر لیا جائے، تو بھی اس کے دورِ جدید

کی شاید ہی کوئی اشاعت ایسی ہوگی جس میں مسلمانوں کی معاشی زندگی سے متعلق کچھ نہ کچھ شائع نہ ہوا ہو لیکن تعجب سے زیادہ موجبِ تاسف دوسرا امر ہے۔

ہمارے معاصر نے لکھا ہے کہ طلوعِ اسلام ایک خالص دینی پرچہ ہے جس میں زیادہ تر دینی مباحث ہی پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایک "دینی پرچہ" میں معاشیات سے متعلق کچھ شائع ہونا فی الواقعہ ایک ایسی چیز ہے جسے مسلمانوں کے سامنے بطور سند پیش کیا جانا چاہئے۔

یعنی معاصر موصوف کے نزدیک بھی دین ایک ایسا شعبہ ہے جسے انسان کی معاشی ضروریات سے کچھ واسطہ نہیں ہونا چاہئے۔ معیشت کی زندگی کا تعلق دنیا سے ہے اور دین کا تعلق انسان کی "روحانی" زندگی سے ہے۔ اور ان دونوں کو باہمی کچھ تعلق نہیں۔ ہم حیران ہیں کہ اگر معاصر موصوف کے اراکین ادارہ بھی جو روشن خیال طبقہ سے متعلق ہیں، دین کے متعلق یہی کچھ تصور رکھتے ہیں تو اس صورتِ حالات پہ جسقدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ طلوعِ اسلام اپنی نشاۃِ اولیٰ سے آجتک اپنی ہر اشاعت، اشاعت کے کم وبیش ہر مضمون اور مضمون کے ہر صفحہ میں اس حقیقت کو دہرائے چلا آرہا ہے کہ قرآن کی رو سے دین اس نظامِ اجتماعی کا نام ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اعلان کی سابقیت کا شرف بھی طلوعِ اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اسلام دین ہے مذہب نہیں ہے۔ طلوعِ اسلام ہی دین اور مذہب کا فرق، واضح اور بین طور پر سامنے لایا جاتا رہا ہے۔ اس نے اپنے دورِ سابقہ میں اگر حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں سرفروشانہ حصہ لیا تو اس لئے نہیں کہ یہ اسے اصطلاحِ عام میں ایک "سیاسی" تحریک خیال کرتا تھا، بلکہ اس لئے کہ اس کے نزدیک تمکنِ دین کیلئے استخلاف فی الارض لاینفک ہے۔ اور جس سرزمین میں قرآن کے مطابق حکومت نہیں ہوتی وہاں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین باقی نہیں رہتا۔ طلوعِ اسلام کے سابقہ مجلدات کی ورق گردانی کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس نے کس طرح نصوصِ قرآنی اور تاریخ وسیر کے نظائر وشواہد سے اس حقیقتِ ثابتہ کو پھر سے مسلمانوں کے سامنے بے نقاب کیا کہ مسلمانوں کی قومیت کا مدارِ اشتراک دین ہے اور دین صرف اس صورت میں دین ہو سکتا ہے جب اس کے فیصلوں کے پیچھے قوتِ نافذہ موجود ہو۔ اسی کا نام مملکت ہے۔ اور قیامِ مملکت کے لئے زمین کا ٹکڑا ناگزیر ہے۔ لہٰذا جب تک مسلمانوں کے پاس کوئی خطۂ زمین ایسا نہ ہوگا جس میں یہ اپنی حکومت قائم کرسکیں، اسلام ان کا دین نہیں قرار پا سکتا۔ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح یہ بھی ایک "مذہب پرست" قوم رہ سکتی ہے۔ یہ حصولِ پاکستان سے پہلے کا ذکر ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام کی ساری سعی وکاوش کا ماحصل یہ ہے کہ اس سرزمین پر جب تک قرآنی نظام کے مطابق تشکیلِ حکومت نہیں ہوگی یہاں دین کا تمکن نہیں ہو سکتا۔ یہاں آج بھی اسلام مسلمانوں کا دین نہیں ہے، صرف مذہب ہے۔ مذہب نام ہے اس شکست خوردہ ذہنیت کا جس میں انسان اپنے آپ کو یہ کہکر فریب دے لیتا ہے کہ انسان کا

خدا سے صرف اتنا تعلق ہے کہ اسکی پرستش کر لی جائے۔ اس پرستش سے انسان میں روحانیت پیدا ہو جاتی ہے جو انسان کی "نجات" کا موجب بن جاتی ہے۔ اس پرستش کیلئے مختلف شعائر، مناسک (رسومات) مقرر ہیں۔ ان کی ادائیگی ان شرائط و حدود کے ساتھ جو ان کیلئے تجویز کر دی گئی ہوں انسانی فرائض میں داخل ہے۔ اگر یہ کر لیا گیا تو انسان پر خدا کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ادا ہو گیا۔ باقی رہے امور دنیوی سو یہ دنیا داروں کے دھندے ہیں۔ ان سے مذہب کا کیا تعلق۔ لہذا مذہب ہر انداز حکومت اور ہر اسلوب معیشت میں زندہ اور قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ مذہب کا کام نہیں کہ ان امور سے الجھتا پھرے۔ تم سیکھ لو ٹھیک ٹھیک ادا کرو۔ نماز کے فرائض و واجبات و سنن و مستحبات اچھی طرح سے یاد کر لو اور نماز پڑھتے وقت ان کا خاص طور پر خیال رکھو۔ وظیفے کرو۔ تسبیح پھیرو۔ مصلے پر بیٹھے رہو۔ ھُو حق کے نعروں سے اللہ کا ذکر کرو۔ لباس کی تراش خراش اور اپنی وضع قطع میں ایک خاص روش کی پابندی کرو۔ بس مذہب قائم ہے۔ زیادہ سے زیادہ شراب خوری، زنا، قماربازی، سینما وغیرہ کے خلاف وعظ کہو اور لوگوں کو منتوں اور سماجتوں سے سمجھا سمجھا کر بزعم خویش امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جاؤ۔ اللہ بھی راضی اور اس کا رسول بھی۔ بس اسی سے تمہاری عاقبت سنور جائیگی۔ باقی رہی یہ دنیا سو اسے جس طریق سے چاہو کماؤ (البتہ اس میں سے "مذہب والوں" کی فتوحات ٹھیک حساب کے مطابق نکال کر دیتے جاؤ)۔ اگر گناہوں کی کثافت زیادہ بڑھ جائے تو انہیں حج کی تقریب پر آب زمزم سے جا کر دھو آؤ۔ اور اس کے بعد اس طرح واپس آ جاؤ جس طرح انسان اپنی ماں کے پیٹ سے معصوم پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہے مذہب اور یہ ہیں اس کے لوازم و شرائط۔ باقی رہی معاشی، معاشرتی، سیاسی یعنی پوری اجتماعی زندگی، سو اس کا تعلق دنیا سے ہے۔ تم اس جھگڑے میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ۔ دنیا [illegible] کے حوالے کر دو۔

یہ ہے مذہب کا تصور جسے طلوع اسلام پہلے دن سے دین کے تصور کے متناقض اور قرآن کی تعلیم کے خلاف قرار دیتے چلا آ رہا ہے۔ اس کے نزدیک قرآن کی تعلیم کا منشا یہ ہے کہ مستبد انسانوں کی مفاد پرستانہ حیلہ بازیوں اور خود غرضانہ دسیسہ کاریوں نے اس کی اجتماعی زندگی میں جو ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں انہیں اس طرح ہموار کر دیا جائے کہ ہر انسان کو اس کی مضمر صلاحیتوں کے پورے پورے نشوونما پانے کے مواقع یکساں طور پر میسر آ جائیں اور کسی کی محنت کا ماحصل کوئی دوسرا نہ لینے پائے۔ قرآن ان معاشی اور اجتماعی ناہمواریوں کو فساد قرار دیتا ہے اور اس قسم کے غیر متوازن نظام کو طاغوتی یا ابلیسی نظام کہہ کر پکارتا ہے۔ اس نظام کو الٹنے کیلئے وہ ہموار اور متوازن جدوجہد کی دعوت دیتا ہے جسے اجمالی طور پر انقلاب کہتے ہیں۔ اس انقلاب کو وہ کسی خاص قوم یا خطہ زمین تک محدود نہیں رکھتا بلکہ عالمگیر حیثیت دیتا ہے کیونکہ اس کا خدا رب العالمین، عالمگیر قانون نشوونما کا مالک ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ انقلاب اپنی صحیح شکل میں اسی صورت میں ظہور پذیر ہو سکتا ہے جب انسان اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو قوانین الٰہیہ کی متعین کردہ مستقل اقدار کے ساتھ ہم آہنگ و موافق کر لے (وحی، قانون مشیت) اور

سماوی (مستقل اقدار کی) اسی ہم آہنگی اور توافق و رفاقت کا نام تقویٰ ہے۔ ان مستقل اقدار (قانونِ سماوی) کا سرچشمہ عالمِ امر ہے اور ان کے انسانوں تک پہنچنے کا ذریعہ وحی۔ انسان کی معاشی زندگی کو آسمانی اقدار (وحی) کے ساتھ ہم آہنگ و متجانس کرنے کی عملی شکل کو دین کہتے ہیں۔

اب آپ خود اندازہ فرمائیے کہ اگر طلوعِ اسلام ایک "دینی" پرچہ ہے اور اس میں دین سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں، تو معاشی زندگی سے متعلق مباحث، اس کے عین مقاصد و مطمح میں شامل ہوں گے یا ایسی مستثنیات میں جن کا ذکر درخورِ استعجاب ہو؟

یہ درست ہے کہ طلوعِ اسلام کمیونزم کا مخالف ہے، اس لئے نہیں کہ کمیونزم معاشی ہمواریاں پیدا کرنا چاہتا ہے بلکہ اس لئے کہ یہ فلسفۂ معیشت اپنے معاشی نظام کو مستقل اقدار کے تابع نہیں رکھتا۔ وہ مستقل اقدار کے وجود ہی کا قائل نہیں۔ وہ اپنے نظام کی بنیادیں محض مصلحت کوشیوں پر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونزم کا فلسفہ، معاشی مساوات کو انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ تنہا عقل کی رو سے انسان طبیعاتی زندگی کی چار دیواری سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا قرآن جو انسانی زندگی کو جوئے رواں قرار دیتا ہے اس قسم کے عاجلانہ (ہنگامی یا افتادہ) نظریۂ معیشت کی کس طرح تائید کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ طلوعِ اسلام (جو قرآنی تعلیم کی تبلیغ و تعمیم کا داعی ہے) سرمایہ داری کے نظام کا مؤید و حامی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، جس نظام کو قرآن طاغوتی قوتوں کا مفسدانہ نظام قرار دیتا ہے اور جسے اس لئے کہ وہ اپنا مدعا و مقصود بتاتا ہو طلوعِ اسلام اس کی تائید کس طرح کر سکتا ہے؟

اب آپ سمجھ لیجئے کہ طلوعِ اسلام کے نزدیک معاشی زندگی کی اہمیت کس قدر ہے اور جب اس نے لکھا تھا کہ "معاشی زندگی کی صالحیت، دینِ مبین کا اہم جزو ہے" تو اس نے کسی نئی بات کا اعلان نہیں کیا تھا۔ بلکہ اسی حقیقت کو دہرایا تھا جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی اور جسے طلوعِ اسلام اپنی زندگی کے پہلے دن سے بار بار دہرائے چلا آ رہا ہے۔ قرآن نے جنت کی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ اس میں بھوک اور پیاس، اور لباس اور مکان کی کوئی تنگی نہ ہوگی۔ سورۂ طٰہٰ میں دیکھئے آدم کو آگاہ کیا گیا ہے کہ ابلیس کہیں تمہیں اس جنت سے نہ نکلوا دے جس کی کیفیت یہ ہے کہ

اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی۔ وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی۔ (۲۰-۱۱۸)

تمہارے لئے یہ جنت کی زندگی ایسی زندگی ہے جس میں نہ تم بھوکے رہتے ہو نہ برہنہ۔ نہ تمہارے لئے پیاس کی تکلیف ہے نہ سورج کی تپش کی۔

اگر تم نے ابلیس کی بات مان لی تو یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے گا اور اس کا نتیجہ ہوگا کہ تم پر بھوک اور پیاس اور بے جگہ و تپش کی تمام مصیبتیں آ پڑیں گی۔ (۲۰-۱۱۷) اس سے چار ہی آیتیں آگے چل کر اولادِ آدم سے کہا گیا ہے کہ ان تکالیف سے بچنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ تم ہمارے بتلائے ہوئے راستہ پر چلو فَمَنِ اتَّبَعَ ھُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی (۲۰:۱۲۳)

جو میرے بتائے ہوئے راستہ پر چلے گا تو اس کی کوششیں رائیگاں نہیں جائیں گی اور نہ ہی وہ ان تکالیف میں پڑیگا۔ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن ومن اعرض عن ذکری "اور جو کوئی میرے قوانین کی یادداشتوں سے پہلوتہی کرے گا" فان لہ معیشۃ ضنکا "تو اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی" اور نحشرہ یوم القیمۃ اعمی (۲۰/۱۲۴) جس دن زندگی متوازن ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگی اس دن وہ اپنے لئے صحیح راہ متعین کرنے کے قابل نہ ہوگا"۔

لہٰذا اوروں کے لئے معاشی نظام سے دلچسپی یا اس کی اصلاح کا محرک جذبہ کچھ ہی ہو۔ طلوع اسلام کے نزدیک یہ دینی فریضہ ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے معاشی خوشحالی جنت کی زندگی ہے اور اس کی تنگی جہنم کا عذاب۔ لہٰذا معاشی ہمواریاں صحیح دینی نظام کا ماحصل ہیں اور اس کی ناہمواریاں طاغوتی نظام کے مفسدانہ عواقب۔ اور ان ناہمواریوں کو ہمواریوں میں بدلنا عین جہاد بشرطیکہ یہ تبدیلی ان مستقل اقدار کے ساتھ ہم آہنگ ہو جو وحی کے ذریعے ہمیں عطا ہوئی ہیں۔ دین کے مناسک و شعائر اسی نظام اجتماعیہ کی تشکیل و استحکام کے ذرائع ہیں جن کا آغاز قیام صلوٰۃ (فقط نماز پڑھ چھوڑنے سے نہیں بلکہ صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرنے) سے ہوتا ہے اور انتہا حج کے عالمگیر اجتماع سے۔ یہ دین کے ارکان ہیں۔ ان کی حقیقت آج "مذہب پرست" مسلمان کو کیسے سمجھائی جائے اور اسے کس طرح بتایا جائے کہ

دو گیتی را صلا از قرأت اوست | مسلماں لایموت از رکعت اوست
نماند کشتۂ این عصر بے سوز | قیامت ہا کہ در قد قامت اوست

یہ دین کی صلوٰۃ ہی کی کیفیت ہوتی ہے جس میں جھکنے سے دنیا بھر کی مستبد و سرکش قوتوں کو قانون خداوندی کی چوکھٹ پر جھکا دیا جاتا ہے اور جس میں اٹھنے سے مظلوم و پامال انسانیت کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہی صلوٰۃ جب "مذہب کی نماز" بن جاتی ہے تو چند بے نتیجہ حرکات سے زیادہ اس کی حقیقت کچھ نہیں رہتی۔ اور اگر اس کے اندر "معنویت" تلاش کی جاتی ہے تو وہ اس قسم کی اعجوبہ پرستی بن کر رہ جاتی ہے۔

سردی بہت زور کی تھی۔ آگ کا الاؤ جل رہا تھا۔ لوگ اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے فقر اور تصوف کی باتیں ہو رہی تھیں۔ حضرت ابونصر سراج جوش میں آگئے اور بیخودی میں انھوں نے اپنا سر آگ میں رکھ دیا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا۔ مرید سخت پریشان ہوئے کہ آپ کا چہرا جل جائیگا مگر آپ نے سر اٹھایا تو چہرہ پہلے سے زیادہ روشن تھا اور اس کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ سر کے بال بھی صحیح سلامت تھے کسی کو آگ نے نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ آپ نے فرمایا جس دل میں اللہ تعالیٰ کی لگن ہو اس کے چہرے کو آگ نہیں جلا سکتی۔ عشق ایک ایسی آگ ہے جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا سکتی ہے۔

حضرت ابوبکر شبلیؒ ایک بار اللہ کے ذکر میں کھوئے ہوئے دریا میں کود پڑے تو لہروں نے اچھال کر آپ کو کنارے لگا دیا۔ یونہی ایک بار آگ میں گھس گئے تو آگ ٹھنڈی ہو گئی اور آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ اسی طرح آپ نے کئی بار اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا مگر خدا خود آپ کا محافظ تھا۔ گزند کیسے پہنچ سکتا تھا! ایک مرتبہ آپ کا پاؤں زخمی ہو گیا اور اس سے خون بہنے لگا۔ آپ کے خون کا جو قطرہ زمین پر گرتا تھا اس سے اللہ کا نقش بن جاتا تھا۔ لوگ آپ کو

(بقیہ لمعات کے صفحہ ... ملاحظہ کیجئے)

کچھ اپنے متعلق

از سینہ تا بہ چند بر آرم، فرو برم
ایں نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدہ است

طلوعِ اسلام کی نشأۃ جدید کو دو سال ہونے کو آئے۔ اس دوران میں ہم نے اپنے متعلق کبھی ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں حلقہ طلوعِ اسلام کو شامل کر لینا ضروری ہے۔ اس لئے ہم نے مناسب خیال کیا ہے کہ اشاعتِ حاضرہ میں یہ گذارشات آپ تک پہنچا دی جائیں۔

قارئینِ طلوعِ اسلام میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں اس سے ایک "خریدار" سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ یہ حضرات ہماری ان گذارشات کے مخاطب نہیں ہیں۔ ان کا مخاطب ہے وہ طبقہ جسے اس سے ایک قلبی لگاؤ ہے۔ جو اسے اپنے خیالات کا ترجمان اور اپنے تاثرات کا مظہر سمجھتے ہیں۔ نہ وہ طلوعِ اسلام کو محض ایک "جنس" سمجھتے ہیں اور نہ طلوعِ اسلام انہیں محض خریدار تصور کرتا ہے۔

طلوعِ اسلام محض ایک رسالہ نہیں بلکہ یہ ایک دعوت کا نقیب اور ایک تحریک کا داعی ہے۔ اس کی اشاعت ایک خاص مقصد کے ماتحت عمل میں آئی ہے اور اس کا ہر قدم ایک خاص نصب العین کی طرف منجر ہے۔ اس نے علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیا ہے کہ جس اسلام کو آج مسلمان اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے وہ قطعاً وہ اسلام نہیں جسے اس کے خدا نے دیا تھا اور جسے اس کے رسولِ اکرم نے عملاً متشکل کر کے دکھایا تھا۔ اس کا موجودہ اسلام مجموعہ ہے چند بے روح عقائد اور چند بے جان رسومات کا۔ یہ ہزار برس سے انہی بے روح عقائد اور بے جان رسومات کو عینِ دین سمجھے ہوئے چلا آ رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر نیا سورج اس کیلئے ذلت و ادبار اور نکبت و افلاس کا رسوا کن عذاب لیکر نمودار ہوتا ہے۔ آج دنیا میں تعداد کے لحاظ سے

اور جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے مسلمانان عالم کو سب سے زیادہ طاقتور ہونا چاہیئے تھا۔ اور اس نصب العین اور پیغام کی رو سے جس کا اس قوم کو حامل بنایا گیا تھا، انسانیت کا امام بنا چاہیئے تھا۔ لیکن باین کثرت و حسن موقعت، ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنی زندگی اور بقا کیلئے اقوامِ یورپ کے رحم و کرم پر ہیں۔ کوئی انہیں زندہ قوموں میں شمار کرنے کیلئے تیار نہیں۔ یہ اسوقت تک سانس لے سکتے ہیں جب تک یورپ کی طاقتیں اپنے مصالح کے ماتحت انہیں سانس لینے کی اجازت دیں۔ باقی رہا شرفِ انسانیت، سو جو قوم اپنی زندگی تک کے لئے دوسروں کی محتاج ہو اسے شرفِ انسانیت سے کیا تعلق؟

ان علاماتِ مرض کو دیکھ لینے کے بعد، طلوعِ اسلام نے علتِ مرض کو بھی پہچان لیا۔ اور علاج کا نسخہ بھی اس کے سامنے آ گیا۔ علتِ مرض یہ ہے کہ مسلمان نے انسانوں کے بنائے ہوئے نظامہائے زندگی کو اپنی حقانی تصور کر رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ عملی دنیا میں ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتا۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ ان تمام غلط نظام ہائے زندگی کو الگ کر کے اس مسلکِ حیات کو اپنایا جائے جو قرآن کی دفتین میں محفوظ چلا آتا ہے اور جس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اسے پھر آگے جانے والوں سے آگے لے جائے اور اس کے ساتھ ہی انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

ہم جانتے ہیں کہ رجعت الی القرآن (Back to the Quran) ہمارے دور کا ایک عام نعرہ اور فیشن میں داخل ہو چکا ہے۔ جس مقرر کو سنئے وہ ایک ہی سانس میں ان پرشکوہ الفاظ کو دہرا دیتا ہے کہ ہماری معاشی۔ معاشرتی۔ تمدنی۔ ثقافتی۔ عمرانی۔ اقتصادی۔ سیاسی۔ روحانی۔ غرضیکہ دین و دنیا کی پوری زندگی کا مکمل ضابطۂ حیات قرآن کے اندر موجود ہے۔ لیکن جب ان سے کہئے کہ ذرا الفاظ کی اس آسمانی دنیا سے نیچے اتر کر واقعات کی اس زمینی دنیا پر آ کر گفتگو کیجئے، تو اس کے پاس اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ نہیں اتنا ہی نہیں بلکہ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہی لوگ جو منبروں اور اسٹیجوں سے اس قسم کے اعلانات کرتے رہتے ہیں، دوسری ہی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن میں تو نماز تک کی ترتیب و تشکیل کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ لیکن طلوعِ اسلام نے جب اس دعویٰ کو پیش کیا ہے تو بلا دلیل پیش نہیں کیا۔ وہ اسے اپنا ایمان سمجھتا ہے اور اس کے اثبات میں اپنے پاس دلائل و تفاصیل رکھتا ہے۔

اس تشخیصِ مرض اور تجویزِ علاج کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس علاج کی عملی شکل کیا؟ بیمار کا یہ عالم ہے کہ وہ طبیب کو دشمن سمجھتا ہے اور معالج کو زہر۔ وہ سکرات موت کی ہچکیاں

سے رہا ہے لیکن اپنے آپ کو بالکل تندرست و توانا سمجھے بیٹھا ہے اور اسے بیمار کہنے والے کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام کے سامنے یہ مشکل بھی ہے اور اسے اس کا پورا پورا احساس۔ اس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ خارجی دنیا میں کسی انقلاب کا امکان نہیں جب تک پہلے داخلی دنیا میں تبدیلی نہ پیدا کر دی جائے۔ جب تک مسلمان کی ذہنی فضا میں تطہیر نہیں ہوتی، اس کی خارجی زندگی کثافتوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنے سامنے قلوب و اذہان میں انقلاب پیدا کرنے کا پروگرام رکھا ہے۔ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت شکن ہے۔ زمانہ ہنگامہ آرائی کا خوگر ہے اور ذہنی انقلاب پر سکوت خاموشیوں کو اپنی منازل طے کیا کرتا ہے۔ ہنگامہ پسند مسلمان، جسے مفاد پرستوں نے برسوں سے بگولے کے رقص اور جھکڑ کے جوش و خروش کا تماشائی بنا رکھا ہے، اس قسم کے خاموش انقلاب کو "بے عملی" کی زندگی سمجھتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غوغا آرائیوں اور ہنگامہ پرستیوں میں ایک خاص لذت ہوتی ہے اور بہت سے پیش پا افتادہ مفاد بھی۔ اس لئے خاموش انقلاب کا مرحلہ نہ صرف ہمت شکن ہوتا ہے بلکہ بہت سی آزمائشوں کا موجب بھی۔ آپ اپنی گزشتہ پچاس سالہ سیاسی اور معاشرتی زندگی کی تاریخ کو سامنے لائیے اور پھر دیکھئے کہ کتنی تحریکیں تھیں جو خلوصِ نیت اور جوشِ عمل کو لئے ہوئے اٹھیں لیکن بعد میں پیش پا افتادہ مفاد کی ترغیب و تحریص کی تاب نہ لاتے ہوئے، ہنگامہ آرائیوں کے طوفان میں بہہ گئیں۔ آغاز کو دیکھئے تو للہیت اور تقویٰ کے تقدس عزائم اور انجام دیکھئے تو وہی پارٹی بازی اور الیکشن سازی! ان حالات میں جبکہ خارجی حوادث کی تلاطم خیزیاں اور مفاد پرستی کی موج انگیزیاں بڑے بڑے صاحبانِ عزم و ہمت کے پاؤں اکھیڑ دیں، این و آں سے کان بند کئے، خاموش ذہنی انقلاب کی دشوار گزار وادیوں کو طے کئے جانا، کچھ آسان کام نہیں۔ للہ الحمد کہ طلوعِ اسلام اس وقت اس آزمائش میں پورا اتر رہا ہے۔ اس کے بہت سے بہی خواہوں نے باصرار تقاضا کیا ہے، اور ان کے تقاضے بدستور جاری ہیں کہ طلوعِ اسلام کو اب اپنی جماعت بنانی چاہیے اور اس طرح کچھ "عملی" کام کرنا چاہیے۔ وہ نہیں جانتے کہ بغیر نام رکھے، طلوعِ اسلام کی جماعت کس طرح بن رہی اور پھیل رہی ہے اور اس کا یہ کام کس قدر "عملی" کام ہے۔ ہر وہ شخص جو طلوعِ اسلام کے خیالات سے ہم آہنگی محسوس کرتا ہے اس کی بے نام جماعت کا دوامی رکن ہے اور اس "بے عمل" ادارہ کا خاموش کارکن۔

یہ ہے طلوعِ اسلام کی وہ جماعت جس پہ اسے فخر ہے۔ اس کے ہاں کوئی رجسٹر نہیں جس میں اس جماعت کے تمام ارکان کے نام درج ہوں۔ (اس لئے کہ اس جماعت کا حلقہ صرف خریداران

تک محدود نہیں) اس جماعت کے کوئی عہدیدار نہیں۔ اس کا کوئی ہنگامی پروگرام نہیں۔ اس میں جاہ و منصب کے لئے کوئی رسہ کشی نہیں۔ اس میں عاجلانہ مفاد کی خاطر کوئی باہمی کشمکش نہیں۔ اس جماعت کا ہر رکن اپنے پیغام کا سرگرم مبلغ ہے لیکن وہ اس پیغام کو اس خاموشی سے آگے پہنچاتا ہے جس طرح اثیری خاموش امواج، فضا میں پھیلے ہوئے پیغامات کو غیر شعوری طور پر اقصائے عالم تک پہنچاتی رہتی ہیں۔ اس تبلیغ و تشہیر سے اس جماعت کا سلسلہ یوں آگے بڑھتا جا رہا ہے جس طرح شام کے بعد، چاندنی کی حسین درپہ سکوت چادر، فرشِ زمین پر خود بخود بچھتی اور آگے بڑھتی چلی جائے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا گیا تو یہ ذہنی ہمواریاں ایک دن ایسے انقلاب کا موجب بن جائیں گی جس میں انسانی زندگی کی تمام موجودہ ناہمواریاں، موزوں ہمواریوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اور یہی انقلاب وہ انقلاب ہو گا جو دردگی طرح اٹھنے کے بعد آنسوؤں کی طرح بیٹھ نہیں جائے گا بلکہ اس سے انسانی زندگی کی عمارت صحیح بنیادوں پہ استوار ہو جائیگی۔

یہ ہے وہ جماعت جو ہماری ان گذارشات کی مخاطب ہے۔ ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام سے ان کا تعلق محض رسالہ اور خریدار کا نہیں بلکہ جماعت کی رکنیت کا تعلق ہے۔ آپ کبھی پرچہ کو یونہی خرید لیتے ہیں۔ اس میں صرف چند پیسوں کے خرچ کرنے کا سوال ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ کسی جماعت کی رکنیت قبول کرتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس جماعت کے مقاصد کیا ہیں اور کیا آپ ان مقاصد سے متفق ہیں۔ جب تک آپ ان مقاصد سے ہم آہنگ نہ ہوں آپ اس کی رکنیت قبول نہیں کرتے۔

ہم اپنی اس بے نام جماعت کے اراکین سے اسی کی توقع کرتے ہیں۔ ہم انہیں طلوعِ اسلام کا خریدار نہیں تصور کرتے۔ اس قرآنی برادری کے افراد سمجھتے ہیں جن کا باہمی تعلق الف بین قلوبکم (دلوں کی تالیف) کے رشتہ سے منسوط ہے۔ طلوعِ اسلام ان تمام افراد خاندان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

جب آپ کسی جماعت کی رکنیت اختیار کرتے ہیں تو اس کے بعد اس جماعت کی فلاح و بہبود خود آپ کی اپنی فلاح و بہبود ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر آپ اپنے آپ کو اس جماعت کا رکن خیال کرتے ہیں تو اس سلسلہ کی توسیع، درحقیقت آپ کے مشن کی توسیع ہو گی۔

لیکن ہم آپ سے صرف توسیع ہی کے متوقع نہیں ہیں۔ تنقید کے بھی خواہاں ہیں۔ جو مقصود و منتہیٰ ہمارے پیش نظر ہے اس میں تبدیلی کے لئے تو ہم کسی شرط پر بھی تیار نہیں۔ اس لئے کہ وہ ہماری زندگی کا مدعا اور ایمان کا جزو ہے۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کیلئے جو

طریق و اسالیب اختیار کئے جائیں ان میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی جماعت طلوعِ اسلام کی مجلسِ مشاورت کا کام دے۔ لہٰذا آپ ہمارے طریق کار کو گہری ناقدانہ نگاہ سے دیکھئے اور اپنے مفید مشوروں سے ہمیں مستفیض ہونے کا موقعہ دیجئے۔ لیکن اس باب میں بھی ایک اصول کو مدنظر رکھئے۔ مشورہ کی حیثیت ہمیشہ مشورہ کی ہوتی ہے، آخری فیصلہ کی نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی کوئی خاص تجویز مشورہ کے بعد، ناقابلِ قبول قرار پا جائے۔ اس صورت میں آپ کو یہ امر ناگوار نہیں گذرنا چاہیے کہ آپ کی تجویز کو اختیار کیوں نہیں کیا گیا۔

طلوعِ اسلام کا باب المراسلات بہت مقبول ہو رہا ہے۔ لیکن بہت سے مستفسر حضرات بار بار ایک ہی استفسار دہراتے رہتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ استفسار سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ اس کا جواب طلوعِ اسلام کے کسی سابقہ اشاعت میں آ تو نہیں چکا۔ پھر بعض حضرات ہم سے "فتویٰ" طلب کرتے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ ہمارا منصب "مفتی" کا نہیں۔ ہم سے جو سوال پوچھا جاتا ہے اس کے جواب میں ہم صرف یہ بتاتے ہیں کہ اس کی بابت قرآن کریم کی تعلیم کیا ہے۔ ہم انفرادی فتاویٰ کے قائل نہیں۔ ہمارے نزدیک قرآنی احکام کا اجراء و تنفیذ اس حکومت کے ذریعے سے ہوتا ہے جو قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔ اس وقت ان احکام کی حیثیت قانونی فیصلہ کی ہوتی ہے جس کے پیچھے قوتِ نافذہ موجود ہوتی ہے۔ فتویٰ کی حیثیت محض رائے کی ہوتی ہے۔ جس کا جی چاہے مانے، نہ چاہے نہ مانے۔ اسلام دین ہے، مذہب نہیں ہے۔

بعض حضرات کی تجویز ہے کہ طلوعِ اسلام میں شائع شدہ استفسارات اور ان کے جوابات کو کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ یہ مشورہ مفید ہے اور ہمارے پیشِ نظر رہے گا۔

"رفتارِ عالم" کے ضمن میں یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ اس میں محض خبروں پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان پر مختصر سی تنقید بھی کی جایا کرے۔ ہم آئندہ اس کی بھی کوشش کریں گے۔

"اسبابِ زوالِ امت" کے موضوع میں بہت سے حضرات نے دلچسپی کا ثبوت دیا ہے۔ ہم سے بار بار پوچھا جا رہا ہے کہ اس باب میں محترم پرویز صاحب نے کیوں نہیں کچھ لکھا؟ ہم اس "ریزولیشن" کو اپنی تائید مزید کے ساتھ محترم پرویز صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی جرات کرتے ہیں، بدیں گذارش کہ

مدار جلوہ دریغ اندلم، کہ فرمنِ حسن
بہ خوشہ چینیٔ آئینہ کم نمی گردد

طلوعِ اسلام کی مالی حالت کے متعلق ہم نے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ نہ ہی اب اس کی تفصیل میں جانا چاہتے ہیں۔ صرف اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس وقت طلوعِ اسلام سخت خسارہ میں جا رہا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جس پرچہ کا مسلک یہ ہو کہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا!

وہ مالی خوشحالیوں کی توقع ہی کیوں رکھے۔ اقتصادی طور پر وہی پرچے پھولتے پھلتے ہیں جو عوام کے رجحان کا ساتھ دیں۔ جس پرچے نے ہر اس غلط روش کی مخالفت کرنی ہو جسے وہ حق کے خلاف سمجھے، خواہ اس کی تائید میں اسے ایک آواز بھی اپنے ساتھ ہم آہنگ نہ نظر آئے، اسے مقبولیتِ عامہ کا درجہ کیسے مل سکتا ہے۔ اور جب وہ عوام میں مقبول ہی نہ ہوگا تو اس کی مالی حالت کس طرح بہتر ہو سکے گی۔ طلوعِ اسلام کی گذشتہ چار برس کی زندگی اور موجودہ دو برس کی زندگی آپ کے سامنے ہے۔ اس کا ایک ایک ورق الٹ کر دیکھ لیجئے۔ غلط روش کی مخالفت میں نہ اشخاص کی وجاہت اس پر اثر انداز ہوتی ہے نہ جماعتوں کی قوت اس کی عنان گیر۔ یہ

کہتا ہے وہی بات سمجھتا ہے جسے حق۔

اس کے سامنے لالچ کے اچھے اچھے سامان رکھے گئے اور ان کی قیمت صرف اتنی مانگی گئی کہ یہ ان کے خاص مفاد کی تھوڑی سی رعایت رکھ لیا کرے۔ لیکن طلوعِ اسلام نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس لئے کہ اگر حق، باطل کے ساتھ مفاہمت پر اتر آئے تو پھر دنیا میں تخریبی قوتوں کو ٹوکنے والا کون رہے گا۔ لہذا اس قدر خسارہ کے باوجود ہم کسی سے کسی مالی امداد کے خواہاں نہیں ہیں۔ ہم آپ سے اتنا بھی نہیں کہتے کہ آپ اس کے خریداروں کا حلقہ وسیع کیجئے۔ البتہ اس کے مقصد کے پیش نظر اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ آپ اپنا پرچہ، اور حضرات تک بھی پہنچا دیا کیجئے۔ اس کے بعد، اگر وہ بطیب خاطر، اس جماعت کا رکن بننا چاہیں تو آپ کی مساعی مشکور ہیں اور آپ نے اپنے فریضۂ تبلیغ کی سرانجام دہی میں ایک قدم آگے بڑھا لیا۔ لیکن آپ کسی پر جبر کر کے، چندہ خریداری وصول نہ کیجئے۔ کیونکہ طلوعِ اسلام کو خریدار مطلوب نہیں، اپنی جماعت کے اراکین مقصود ہیں۔ البتہ ایک شکل ایسی ہے جس میں آپ اقتصادی شعبہ میں بھی ہماری معاونت کر سکتے ہیں اور وہ ہے طلوعِ اسلام کیلئے اشتہارات کی فراہمی۔ طلوعِ اسلام ملک کے ممتاز طبقہ میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس لئے اس میں شائع شدہ اشتہارات، عمدہ نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ آپ اپنے حلقۂ اثر میں کوشش کر کے اس کیلئے سنجیدہ قسم کے اشتہارات حاصل کیجئے۔ اشتہارات کا نرخ حسب ذیل ہے۔

ٹائیٹل ملا	-/75 روپے فی اشاعت
ٹائیٹل ملا و ملا	-/60 روپے فی اشاعت
اندر کے صفحات	-/50 روپے فی اشاعت

(ایک صفحہ سے کم کا اشتہار نہیں لیا جاتا اور ٹائیٹل کے صفحات چھ ماہ سے کم کیلئے مختص نہیں کئے جاتے)

انتظامی امور میں طلوعِ اسلام سخت نامساعدتِ حالات کا شکار چلا آرہا ہے۔ کراچی میں طباعت اچھی نہیں ہوتی اس لئے باوجود بہترین کتابت کے، پرچہ دیدہ زیب نہیں چھپتا۔ کاغذ اخباری (نیوز پرنٹ) استعمال کرنا پڑتا ہے، جو طباعت کو بالکل نکھرنے نہیں دیتا۔ اس کی ضخامت کے متعلق بعض حضرات نے شکایت لکھی ہے۔ شروع شروع میں پرچہ سو صفحہ سے بھی زائد پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی سطر کشادہ تھی (قلم جلی اور صفحہ کی سطریں کشادہ)۔ بعد میں اس کا قلم نسبتاً خفی کر دیا گیا اور سطریں زیادہ گنجان۔ اس سے ہوا یہ کہ پہلے جس قدر عبارت قریب سو صفحات میں آتی تھی، اب وہی اتنی صفحات میں سما جاتی ہے۔ لہٰذا صفحات کی کمی سے قارئین کو کچھ خسارہ نہیں ہوا۔ ہمیں کچھ سہولت ضرور ہو گئی ہے۔

قیمت کے متعلق (اگرچہ جماعت کے اراکین سے کچھ کہنا ضروری نہیں تاہم) اتنا عرض کر دینا شاید ناگوارِ خاطر ہو کہ ولایت سے ایک رسالہ شائع ہوتا ہے "فلاسفی" وہ طلوعِ اسلام کے سائز کے قریب اسی صفحات پر مشتمل ہوتا ہے (اور جتنی عبارت اردو نستعلیق میں آجاتی ہے، انگریزی ٹائپ میں اس سے کہیں کم عبارت آتی ہے)۔ اور اس کی ایک کاپی کی قیمت ہے چار روپے آٹھ آنے۔

ایک مشورہ یہ بھی دیا گیا ہے کہ طلوعِ اسلام کا موجودہ سائز موزوں نہیں۔ اسے اس سائز پر چھاپا جائے جس پر عام رسائل (مثلاً ہمایوں) چھپتے ہیں۔ اس سائز کو مطبع کی اصطلاح میں ۲۰×۳۰ کہتے ہیں اور طلوعِ اسلام کا موجودہ سائز ۲۰×۲۶ ہے۔ یہ مشورہ مفید ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۵۰ء سے طلوعِ اسلام بڑے سائز پر شائع ہوگا۔ جنوری سے اس لئے تاکہ دسمبر تک کے پرچے ایک ہی سائز کے ہوں اور ان کی جلد بندھوانے میں دقت نہ ہو۔

لیکن سب سے بڑی دشواری جس نے اس دو سال میں طلوعِ اسلام کا گلا گھونٹ رکھا ہے، ڈاکخانہ کی بدنظمی ہے، حیرت ہے کہ اس دو اڑھائی سال کے عرصہ میں یہ محکمہ ابھی تک اپنی خرابیاں دور نہیں کر سکا۔ اس بدنظمی کا نتیجہ تھا کہ ہمیں قریب پچاس فیصدی پرچے ہر ماہ دوبارہ بھیجنے پڑتے تھے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کا مستقل زائد خرچ کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

مجبوراً آپ سے درخواست کرنا پڑی کہ پرچہ بصیغۂ رجسٹری منگائیے۔ ہمیں احساس ہے کہ ایک پرچہ پر ہر ماہ کا زائد خرچ کس قدر گراں گذرتا ہے لیکن اس کا کچھ اور علاج سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ رجسٹری شدہ پرچے بھی گم ہو جاتے ہیں اور دوبارہ بھیجنے پڑتے ہیں۔ ہم اس زائد خرچ اور زحمت کو بھی برداشت کر لیتے ہیں لیکن جن الفاظ میں ہمیں شکایت (کی گالیاں) سننا پڑتی ہیں وہ یقیناً ناقابلِ برداشت ہوتی ہیں۔ آپ یقین مانئے کہ پرچہ بھیجتے وقت ہر ممکن احتیاط برتی جاتی ہے، کہ کسی صاحب کا پرچہ پوسٹ ہونے سے رہ نہ جائے۔ اس کے بعد پرچہ کا منزلِ مقصود تک پہنچانا ہمارے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔

آپ تو صرف پرچہ نہ پہنچنے پر اس قدر برافروختہ ہو جاتے ہیں، آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ آپ کے ارسال فرمودہ چندہ کی سینکڑوں روپوں کی رقوم ہم تک نہیں پہنچیں اور ڈاک خانہ میں کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ ہم تو آپ کو دوبارہ پرچہ بھیج دیتے ہیں لیکن آپ سے دوبارہ چندہ طلب نہیں کرتے۔ اس نقصان کو ہم خود برداشت کرتے ہیں۔ ان مشکلات کا کیا حل!

آئندہ کے لئے۔

(۱) اسے ہم آپ پر چھوڑتے ہیں کہ آپ پرچہ بصیغہ رجسٹری منگائیں یا عام ڈاک میں۔

(۲) ڈاک خانہ والوں نے پرچہ لینے کی تاریخیں ۵-۸-۱۰- اور ۱۵ مقرر کی ہیں۔ اگر آپ کو دس تاریخ تک بھی پرچہ نہ ملے تو ۱۵ ر سے پہلے پہلے آپ کی شکایت ہم تک پہنچ جانی چاہئے تاکہ پرچہ دوبارہ روانہ کر دیا جائے۔ اگر آپ کی شکایت پندرہ تاریخ کے بعد پہنچی تو ہم پرچہ بھیجنے سے معذور ہوں گے۔

اس مرتبہ التزام یہ کیا گیا ہے کہ تمام خریداروں کا چندہ دسمبر کے پرچے کے ساتھ ختم ہو جائے تاکہ نئے سال سے نیا حساب شروع ہو۔ معاملہ کی دنیا میں طلوعِ اسلام اپنے اور خریداروں کے درمیان ہمیشہ صفائی کو ملحوظ رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حساب میں غلطی رہ جانے کا امکان ہوتا ہے۔ اگر آپ کا چندہ دسمبر کے پرچہ کے ساتھ ختم نہ ہوتا ہو تو آپ براہ کرم فوراً ایک کارڈ لکھ دیجئے تاکہ حساب فہمی کر لی جائے۔ اگر آپ کی طرف سے کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تو ہم سمجھ لیں گے کہ آپ کا چندہ دسمبر کے پرچے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

اب ہم اس مرحلہ تک آپہنچے ہیں جہاں ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ دسمبر کا پرچہ جب آپ تک پہنچ جائے گا تو اس کے ساتھ آپ کا چندہ ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے پرچہ

جاری رکھنا ہے تو آپ کو چندہ کی تجدید کرنی ہوگی۔ اگر آپ صرف اتنا کر دیں کہ بجلی زر چندہ دسمبر کے مہینے میں بھیج دیں تو ہمارے لئے آسانی پیدا ہو جائے گی۔ ہم الگ الگ اطلاعات نہیں بھیجیں گے کہ اس سے ڈاک کا خرچ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اسی اطلاع کو انفرادی سمجھ لیجئے۔ زر چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجئے یا بذریعہ چیک۔ چیک پر یہ الفاظ لکھئے۔ شہ

MANAGER, TALU-E-ISLAM

پرچہ بذریعہ وی۔پی نہ منگائیے۔ وی پی کی رقوم آپ ادا کر دیتے ہیں لیکن ہم تک یا تو پہنچتی ہی نہیں اور اگر پہنچتی ہیں تو بہت دیر میں۔ محفوظ ترین صورت بذریعہ چیک ہے۔ چیک کو کراس کر دیجئے۔ لیکن روپیہ جس صورت میں بھی بھیجئے۔ اس کی اطلاع اپنے صاف اور پورے پتہ کے ساتھ الگ بھیجئے۔

پھر سن رکھئے کہ روپیہ بھیجنے کی اطلاع الگ بھیجئے اور اس اطلاعات میں اپنا پتہ صاف اور پورا لکھئے۔

آخر میں اس حقیقت کو پھر ایک مرتبہ سامنے لے آئیے کہ طلوع اسلام کا آپ سے خریداری کا تعلق نہیں۔ وہ آپ کو اپنی جماعت کے ارکان سمجھتا ہے۔ اگر آپ بھی اس کے ساتھ یہی رشتہ سمجھتے ہیں تو پھر اپنے آپ کو محض خریدار نہ تصور فرمائیے۔ نہ ہی طلوع اسلام کو اپنے سے کچھ الگ سمجھئے۔ یہ عجب کہ ہمارا باہمد گر یہی تعلق ایک دن اس اجتماعی زندگی کا ہیولیٰ بن جائے جسے سورج کی آنکھ نے ایک مرتبہ دیکھا ہے اور اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ اس طرح سرگرداں پھر رہا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

قاضی غلام علی صاحب توجہ فرمائیں

آپ کا منی آرڈر مبلغ ۴/- روپے مل گیا ہے کوپن پر آپ نے صرف غلام علی قاضی سکنہ سویانوالہ لکھا ہے۔ پتہ نامکمل معلوم ہوتا ہے آپ اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں تاکہ پرچہ جاری کیا جائے۔

نیاز مند

ناظم طلوع اسلام

شہ یہ پتہ صحیح نہیں لیکن بنک والوں نے یہ لفظ یونہی لکھ دیا ہے۔

مسلمان کی زندگی

پرویز

انسان پر جب مایوسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں ظلمت کدۂ عالم میں امید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی۔ تمام اسباب وعلل ایک ایک کرکے جواب دیدیتے ہیں تو اس کا دل بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی کے تمام ناکام تجارب کی یاد پھر سے تازہ ہوجاتی ہے۔ عمر بھر کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے نقوش خاک کے ذروں سے اُبھرتے چلے آتے ہیں۔ وہ ان کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی اُسے مسلسل مصائب وتکالیف کی اندوہناک داستان معلوم ہوتی ہے۔ انسان اُسے ایک بیکس و بے بس مجبور و مظلوم قیدی کی طرح نظر آتا ہے جسے فطرت کی چیرہ دستیوں نے جور و ستم اور ظلم و استبداد کی المناک صعوبتیں جھیلنے کے لئے اس وحشت ناک کرہ میں بھیجا ہے۔ چونکہ دنیا کی ہر شے وہی کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے انسان اُسے دیکھے، اس لئے جب وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کہیں مسرت و شادکامی کی نورانی کرن نظر نہیں آتی۔ ہر چہرہ تبسم ناآشنا اور ہر پیشانی غم آلود دکھائی دیتی ہے۔ وہ سوچتا ہے اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

> زندگی مصائب کا دوسرا نام ہے خالص اور دوامی مصائب۔ ہر آرزو ایک مستقل تکلیف کا پیش خیمہ ہے۔ لہٰذا سکون واطمینان عدم آرزو میں ہی ہے۔ (مہاتما بدھ)

وہ حیاتِ انسانی کو ایک لغو و باطل شے قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ "زندگی محض سراب ہے۔ دھوکا ہے۔ مایا کا جال ہے۔" (اپنشد) وہ "زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق خیال کرتا ہے۔" (شوپنہار) وہ اس مصیبت کدہ سے دور بھاگنا چاہتا ہے۔ اسے چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ چونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ناکامیوں کے پردوں میں دوسرے انسانوں کے ہاتھ پوشیدہ ہیں، اس لئے اسے عام انسانوں سے نفرت ہوجاتی ہے اور عام انسانوں میں سے چونکہ صاحبانِ ثروت و اقتدار کو وہ اپنی لٹی ہوئی مسرت کا غاصب سمجھتا ہے اس لئے دولت و ثروت، شوکت و سطوت کے خلاف اس کے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ جاتی ہے۔ وہ انسانوں کی بستیوں کو چھوڑ کر دور جنگلوں میں جا کر بسیرا کرلیتا ہے اگر اسے انسانوں میں رہنا بھی پڑے تو وہ دولت و عزت کے خلاف جہاد کرنا سب سے بڑی خدمتِ خلق

سمجھتا ہے وہ یہ کہہ کر اپنے قلبِ محزوں کو تسلی دے لیتا ہے کہ خیر اس دنیا میں تو یہ جو جی چاہے کریں آسمانی بادشاہت میں تو ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ ستم رسیدہ، کمزور، ناتوان، ضعیف، مغلوب و مقہور انسانوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا ہے کہ یہ دنیا تمہارے لئے نہیں ہے اس کے طالب خدا کی نگاہوں میں مردود و ملعون ہیں۔ البتہ اس کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں دولت و حشمت کے مالک ذلیل و خوار ہوں گے، اور جو آج ذلیل و خوار ہیں وہ معزز و مکرم۔ آسمانی بادشاہت انہی مفلس و غریب انسانوں کی وراثت ہے۔ نروانا میں یم کے مقرب یہی لوگ ہوں گے۔ دیولوک میں برہما کے ہم آغوش ہونے والے یہی بھگت ہیں۔ یہی تعلیم کنیسہ و صومعہ کے راہب کی اصل ایمان ہے۔ یہی فلسفہ تارک الدنیا سنیاسی اور تیاگی بھکشو کا سچا دھرم ہے۔ اس فلسفہ اور مشرب کی لِم یہ ہے کہ حال کو ذلیل کر کے مستقبل کو مزین بنایا جائے۔ دنیا کی رسوائیاں، عاقبت کی سرفرازیاں قرار دی جائیں۔ یہاں کی ذلت آنے والی زندگی کی عزت ہو۔ یہاں جتنا پست ہو وہاں اتنا ہی بلند ہو۔ یہاں کا محتاج وہاں کا غنی، یہاں کا تباہ حال وہاں کا خوشحال، اور یہاں کا نادار وہاں کا مالک ہو۔ وہ یہاں کے مصائب و آلام کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھائے کہ یہ آسے وہاں کی ابدی مسرتوں کا پیام دے رہے ہوں۔ غرضیکہ وہ دنیا و آخرت کے درمیان، ایک ایسے ناقابلِ شکست آئینہ کی سدِّ سکندری قائم کر دے جس میں یہاں کا ہر نقش معکوس دکھائی دے۔

لیکن کیا یہ تعلیم، فطرت کی تعلیم قرار دی جاسکتی ہے؟ کیا انسان واقعی اس دنیا میں ایک مجبور و مقہور قیدی کی حیثیت سے لایا گیا ہے کہ وہ اس جیل خانے میں عمر قید رہے؟ کیا اس کی تخلیق سے فی الواقعہ یہی منشا ہے کہ وہ فطرت کے ہر تقاضے کے خلاف جنگ کرتا رہے اور ان جذبات کے فنا کر دینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھے؟ کیا دنیا اور اس کی نعمتیں واقعی قابلِ نفرت و ملامت ہیں؟ کیا یہاں کی ہر ہاؤ نی سے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے؟ کیا مقصدِ حیاتِ انسانی ذلت و رسوائی، محتاجی و ناداری، نکبت و مسکنت، افلاس و زبوں حالی اور مغلوبیت و مقہوریت ہی ہے؟ پھر کیا ایک آنے والی زندگی کی تمام برکات و نعم، یہاں کی رسوائیوں اور ذلتوں کے معاوضے میں ملیں گی؟ کیا آسمانی بادشاہت اسی قسم کی خدائی فوج کا حصہ ہوگی جو دنیا میں ہر قوت سے ڈرتی، دبکتی، دن گزار رہی ہو۔ کیا خدا کا مقرب وہی ہوگا جسے دنیا میں کوئی اپنے پاس بٹھانا پسند نہ کرے؟ کیا دولت و حشمت، عزت و وقار کی زندگی واقعی جنت سے محرومی کا سبب ہوگی؟ کیا یہاں کے مرفہ الحال لوگوں پر وہاں کا باب السلام قطعاً مسدود ہوگا؟ کیا یہاں کے چاندی اور سونے کا ہر ٹکڑہ جہنم کے طوق و سلاسل بنانے کے کام میں لایا جائے گا؟ ذل و مسکنت کیا واقعی خدا کی رحمت ہے؟

وسعت و فراخی کیا فی الحقیقت اس کا عذاب ہے؟

ان سوالات کا جواب، آپ اپنے دماغ سے کہ جس پر ایک عرصہ دراز سے خاص ماحول اور مخصوص تعلیم کے پردے پڑے ہوئے ہیں، کچھ ہی دیجئے اور اس سے مطمئن ہو جائیے لیکن آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم ان کی بابت ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے کہ وہی تعلیم تعلیم فطرت اور وہی حکم حکم خداوندی ہو گا۔

قرآن کریم ہمیں کھلے کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ انسان کی پوزیشن اس کائنات میں ایک مخدوم کی ہے اور جملہ موجوداتِ عالم اس کے خدمت گزار اور مطیع ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۴۵:۱۳)

پستیوں اور بلندیوں (ارض و سمٰوات) میں جو کچھ ہے سب کے سب تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔

لہذا انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنا تابع فرمان بنائے۔ فطرت کی ہر چیز سے کام لے کر ایک مدت معینہ تک یہ سب اس کی متاع ہیں۔ دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزیں خدا تعالیٰ نے قطعاً حرام نہیں کیں (۳۲:۷) بلکہ ان میں انسان کے لئے ایک خاص کشش و محبت رکھی ہے (۳:۱۴) ان سے تمتع حاصل کرنا، ان سے فائدہ اٹھانا، ان کو کام میں لانا ہی ان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اور اسی انتفاع و تمتع کا نام دنیا میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ دولت و حشمت کے غلط استعمال سے ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی ناہموار ہو جاتی ہے جس سے ہمارے اجتماعی نظام میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ دنیا سے الگ ہو جانا ہی اس کا علاج ہے۔ اگر دولت و قوت کی بے لگام سرکشی انسانی فضیلت نہیں تو ذلت و پستی کی زندگی بھی تو انسانی تخلیق کی غرض و غایت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت انبیاء کرامؑ کی تعلیم ہمیشہ اسی افراط و تفریط کو مٹانے کے لئے ہوتی تھی۔ اگر آپ غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ خدائے قیوم کا ازلی پیغام، جو ان حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا، اس باب میں اس کا شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی لَم رہی ہے۔ یعنی وہ ان عیوب و نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو دولت و سطوت کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور دوسری طرف ضعیف و ناتوان لوگوں کو ابھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے، اور انہیں ایسی تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وہ عیوب پیدا نہ ہوں جو مترفینؑ میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ دولت و ثروت کے غلط استعمال سے نظامِ انسانی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے لہذا حضرت انبیاء کرامؑ جن مستضعفین کو ابھار کر بلند سطح پر لاتے تھے انہیں تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا! تم خود حدود اللہ کی نگہداشت کرنا، ورنہ ان کے توڑنے سے تمہارا بھی وہی انجام ہو گا جو

تمہارے متقدمین کا ہو چکا ہے۔ وہ قوانینِ الٰہی سے منہ موڑ لینے والے انسانوں سے دنیا چھین کر، ان کمزوروں کو دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انھیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کر دیتے تھے جس سے ان کے اور خدا کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور اس طرح انسانیت کا نظام متوازن و ہموار طریق پر چلتا رہے۔ بس یہ ہے خلاصہ تعلیمِ فطرت کا جو انسانوں کی ہدایت کے لئے زمین پر بھیجی جاتی رہی۔ اور اسی پر عمل پیرا ہونے کا نام دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سرخروئی ہے۔ میزانِ خداوندی کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیے۔ نظامِ انسانیت کی گاڑی کے یہ دو پہیے ہیں جو ہمیشہ ہموار و استوار رہنے چاہئیں۔ آزادیوں کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کے یہ دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے ابھر نہیں سکتا اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حد یہ وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدوسیوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اگر نعمائے آخرت خدا کا انعام ہیں تو دنیاوی شوکت و عظمت بھی کچھ کم نعمت نہیں۔ اور یہ وہ نعمت ہے جس کی یاد دہانی اقوامِ عالم کو بار بار کرائی جاتی رہی ہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے یہی فرمایا کہ خدا کی اس نعمت و قدرت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ نوحؑ کے بعد استخلاف فی الارض کی بخشش سے نوازا اور تمہیں قوت و حشمت میں برتری عطا فرمائی۔ لہٰذا

فَاذْكُرُوْا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۷ : ۶۹)

اللہ کی یہ نعمت یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو۔

یہی حضرت صالحؑ نے قومِ ثمود سے کہا۔

> تم خدا کی اس بخشش کو یاد کرو کہ اس نے تم کو قومِ عاد کے بعد جانشین بنایا۔ اور تمہیں زمین میں تمکن کیا۔ تم نرم نرم زمین پر محلات بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (محفوظ) عمارات تعمیر کرتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتوں کو پیشِ نظر رکھو اور زمین میں فساد مت پیدا کرو۔ (۷ : ۷۴)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم زمین میں قلیل تھے اور اس نے تمہیں کثرت عطا فرمائی۔ (۷ : ۸۶) حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی حسنات دی گئیں اور آخرت میں بھی۔ (۱۶ : ۱۲۲) اور آلِ ابراہیمؑ۔ کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ ملکِ عظیم کی بھی مالک بنائی گئی۔ (۴ : ۵۴) اور اس کو اللہ کا فضل قرار دیا۔ حضرت یوسفؑ کو اس قدر ابتلا و آزمائش کے بعد جس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا گیا وہ یہی تمکن فی الارض تھا اور اس عطیۂ کبریٰ کو ان کے صبر و تقویٰ کا اجرِ جزیل کہا گیا۔

اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو زمین میں صاحبِ حکومت بنا دیا۔ (متمکن فی الارض کر دیا)

جہاں چاہیں رہیں سہیں۔ ہم جس پر اپنی رحمتیں چاہیں بہنچا دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ (۱۲:۵۶)

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان اسی قوت وحشمت، تمکن وتسلط کی مسلسل تاریخ ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ جس شدت وتکرار سے اس قوم کے واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں، کوئی اور واقعہ اس شدومد سے دہرایا نہیں گیا۔ اس تمکن کو کمزوروں پر خاص احسان کہا گیا ہے۔

ہم چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو کمزور کر دیا گیا تھا ان پر احسان کریں اور ان کو دیگر اقوام کا امام بنا دیں اور ان کو (ملک کا) وارث قرار دیدیں۔ اور ان کی حکومت کو زمین پر قائم کر دیں اور فرعونؔ ہامانؔ اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھا دیں جس سے وہ بچا چاہتے تھے۔ (۲۸:۵-۶)

چنانچہ اسی ضعیف وناتواں، اسی محکوم ومغلوب قوم کو بالآخر مشارق ومغارب کا حکمراں بنا دیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۢ بِمَا صَبَرُوْا ۗ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۷:۱۳۷)

اور ہم نے اس قوم کو جو بالکل کمزور شمار کی جاتی تھی اس بابرکت زمین کے مشرق ومغرب کا مالک بنا دیا اور آپ کے رب کا وعدہ حسنہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے استقلال کی وجہ سے یوں پورا ہو گیا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ اور فلک بوس عمارات کو درہم برہم کر کے رکھدیا۔

صبر وتوکل، سعی وعمل کا یہی وہ انجام تھا جس کے لئے حضرت موسیٰؑ نے پہلے ہی اپنی قوم سے وعدہ کر رکھا تھا۔

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدائے تعالیٰ سے مدد مانگو اور مستقل مزاج رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ جسے چاہے (اپنے قانون کے مطابق) اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بنا دے۔ اور آخری انجام تو متقین کیلئے ہی ہے۔ (۷:۱۲۸)

چنانچہ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی یاد بار بار بنی اسرائیل کو دلائی گئی ہے۔

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے تم کو نوازا تھا۔ اور تمہیں تمام اقوام عالم پر برتری عطا کی تھی۔ (بقرہ ودیگر مقامات)

اور جب اسی قوم نے قوانین الٰہی سے سرتابی اختیار کر لی تو خدا کی طرف سے جو سب سے بڑا عتاب ان پر نازل ہوا وہ اسی نعمتِ کبریٰ کا چھن جانا تھا۔

وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔ (۲/۶۱)

اور ان پر ذلت اور مسکینی کی مار پڑ گئی۔ اور وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہوگئے۔

مذکورۂ صدر قصص، قرآن کریم میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ قصص القرآن کا مقصد محض وقائع نگاری نہیں بلکہ ہر قصہ اور اس کا ہر بیان اپنے اندر عبرت و موعظت کی کھلی کھلی بصیرتیں رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم امم گذشتہ کے احوال و ظروف کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتا ہے اور بار بار تاکید کرتا ہے کہ غور و فکر سے دیکھو کَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ جن قوموں نے قوانینِ الٰہی کی تکذیب کی ان کا کیا انجام ہوا۔ ظاہر ہے کہ ان اقوام کے دنیاوی انجام کی طرف توجہ دلانا ہی مقصود ہے، کیونکہ اخروی انجام تو کسی کی آنکھوں کے سامنے آ نہیں سکتا۔ ان میں سے بہت سی قومیں تو قانونِ خداوندی کے مطابق صفحۂ کائنات سے حرفِ مکرر کی طرح مٹ گئیں اور ان کی بعض داستانیں تاریخ میں باقی رہ گئیں وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ (۲۳:۴۴) اور بعض قومیں گو زندہ رہیں (اور اب بھی زندہ ہیں) مگر ان کی حالت عبرت و نصیحت کی زندہ داستان ہے۔ پھر قرآن کریم نے ان تاریخی نتائج کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ واضح الفاظ میں یہ بھی ذہن نشین کرا دیا کہ اس دنیا میں عزت و توقیر کی زندگی اللہ کی رحمت ہے اور یہاں کی ذلت و خواری اس کا غضب اور عذاب ہے۔ مثلاً کہیں یہ وعدہ ہے کہ "تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں ان کو وہ زمین کا بادشاہ بنائے گا۔" (۲۴:۵۵) کہیں یہ تشریح ہے کہ "جو کوئی عمل صالح کرے گا۔ وہ مرد ہو یا عورت۔ شرط یہ ہے کہ مومن ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔ اور جو اچھے کام ان سے عمل میں آتے ہیں ان کا اجر دیں گے۔" (۱۶:۹۷) جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر چھوڑتا ہے اسے اس دنیا میں بہترین گھر دیا جاتا ہے۔ (۱۶:۴۱) جو اس کے دیئے ہوئے کی قدر کرتا ہے، اپنی قوتوں اور اس کی نعمتوں کو ٹھیک ٹھیک طور پر مصرف میں لاتا ہے کہ یہی عملاً شکر نعمت ہے، اللہ ان نعمتوں میں اور زیادتی کرتا جاتا ہے۔ (۱۴:۷) برعکس اس کے جو قوانینِ خداوندی سے بلا علم و ہدایت، بلا دلیل و برہان جھگڑتا ہے، ان قوانین سے منہ موڑ لیتا ہے، وہ خود بھی منزلِ مقصود تک لے جانے والے راستے سے بھٹک جاتا ہے اور دوسروں کو بھی بہکاتا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اسے دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوگی اور اس کے بعد کی زندگی میں عذاب حریق ملے گا۔ (۲۲:۸) اسی طرح جو اس کے قوانین اس طرح سے مانے کہ جو بات اپنے مطلب کی ہو اسے اختیار کرے اور جس میں کسی قربانی و ایثار کی ضرورت ہو اور وہ اس کی تن آسانی پسند طبیعت پر گراں گزرے اور وہ اس سے پہلو تہی کرلے اس کے لئے بھی خِزۡيٌ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا کا رسوائی آمیز عذاب بتایا گیا ہے۔ (۲:۸۵)

ایک دو نہیں سینکڑوں آیات اسی اصول کی تشریح اور اسی نکتہ کی تفصیل میں موجود ہیں۔ اس اعتقاد کو دلوں میں اچھی طرح جاگزیں کر دینے کے بعد مسلمانوں کے لئے ایک دستورالعمل، ایک لائحہ حیات تجویز کیا گیا کہ جس سے وہ ان تمام نعمتوں کے وارث و مالک ہونے والے تھے جو اقوام گذشتہ کو مل چکی تھیں اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود تھا۔ ان برکات کے حصول کی شرط ایمان و تقویٰ تھی۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷:۹۶)

اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم یقیناً ان پر آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیتے۔

اور اسی ایمان و تقویٰ سے مسلمانوں کو دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہونے والی تھی۔

اے ایمان والو! اگر تم نے نظام تقویٰ اختیار کیا تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا فرمائیگا اور تمہاری لغزشوں کو دور کر دے گا اور تمہاری کوتاہیوں سے درگذر کریگا! و اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔ (۸:۲۹)

اس لائحہ عمل کی رو سے جو قرآن کریم نے تجویز کیا ایک مسلم کی تمام زندگی مسلسل جدوجہد، غیر منقطع سعی و عمل، ان تھک کوشش، کوہ شکن عزم، غیر متزلزل استقامت، پیہم جہاد اور یکسر سپاہیانہ زندگی تھی جس کا مقصد محض "عاقبت سنوارنا" ہی نہ تھا بلکہ اپنے حسن و عمل، اپنے اعمال صالح کے جیتے جاگتے نتائج اس دنیا میں دیکھ لینا بھی تھا۔ ذلت و پستی کی زندگی، محتاجی و فلاکت کی زندگی، مجبوری و بے بسی کی زندگی، کہ جسے قرآن نے غضب خداوندی کا نتیجہ قرار دیا تھا، نصیب اعدا کر کے خود عزت و وقار کی زندگی، خوش حالی و خوش بختی کی زندگی، عظمت و شوکت کی زندگی، حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنا تھا کہ یہی قرآن کریم کی رو سے ایک مومن و عمل صالح کرنے والی جماعت کی حیات طیبہ ہو سکتی تھی۔ ان کے نزدیک عبادات و اعمال کا ماحصل "اپنے اللہ سے دین و دنیا کے حصے لینا تھا" (۳:۱۴۷) وہ قوم بننا تھا جسے خدا نے تمام اقوام عالم میں سے وراثت کتاب کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ (۳۵:۳۲) جسے نوع انسانی میں سے بہترین امت قرار دیا تھا (۳:۱۰۹) ایسے عباد صالح بننا تھا جن کے لئے وراثت ارضی مقدر ہو چکی تھی۔ (۲۱:۱۰۵) اور عملاً بتا دینا تھا کہ خدا کے اس اٹل قانون میں اس کے بندوں کیلئے ایک عظیم الشان پیغام موعظت ہے۔ بلاغ مبین ہے۔ (۲۱:۱۰۶) اور ساری دنیا کو دکھا دینا تھا کہ ہاں! جو سچے مومن بن جائیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (۱۰:۶۴)

ان کیلئے اس دنیا کی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں اور آخرت میں بھی۔ قانون الٰہی غیر متبدل ہے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

نہیں، بلکہ یہ ثابت کر دیا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ ہم دنیا میں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد کیا کرتے ہیں۔ (۴۰:۵۱) یوں پورا ہوا کرتا ہے۔ مسکانِ ارضی کو عملاً بتا دیا تھا کہ کس طرح صبر و صلوٰۃ سے استعانت طلب کی جاتی ہے۔ (۲:۴۵) کس طرح دشمنوں کے جمِ غفیر کے مقابلہ میں ڈٹ کر اللہ کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے کہ جس سے فتح و ظفر رکاب چومتی ہے۔ (۸:۴۵) الغرض انہیں اپنے اعمال سے جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کر کے یہ دکھا دینا تھا کہ یاد رکھو تمام خوبیاں، ہر قسم کی کامیابیاں صرف مومنین کے لئے ہیں، مجاہدین کے لئے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْخَیْرٰتُ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹:۸۸) اور یہی لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں؛ انہوں نے یہ کچھ کر کے دکھا دیا اور ان کے رب نے وہ تمام وعدے پورے کر دیئے جو ان سے کئے گئے تھے۔

وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَھُمْ وَدِیَارَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْھَا ۚ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا (۳۳:۲۷)

اور اس نے تم کو (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا اور اس سرزمین کا بھی کہ جہاں ابھی تمہارے قدم بھی نہ پہنچے تھے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

یہ تعداد میں تھوڑے تھے، لیکن ان کے حوصلے بڑھانے کیلئے ان کے خوابوں میں انہیں دشمن تھوڑے دکھلائے جاتے (۸:۴۳) جب مقابلہ ہوتا تو ان کے نورِ ایمان سے مخالفین کی آنکھیں خیرہ کر دی جاتیں کہ جس سے یہ انہیں زیادہ دکھائی دیں۔ (۸:۴۴) کہیں ایسے لشکروں کو بھیج کر ان کی مدد کی جاتی کہ جن کو کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی اور جس سے ان کے دلوں میں سکینت و تثبیت اور ان کے اعداء کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا جاتا۔ (۸:۱۲) کبھی ان میں کا ایک ایک دو دو پر بھاری ہوتا (۸:۶۶) کبھی دس دس پر (۸:۶۵) ہاتھ ان کے ہوتے اور مارنے والا خود خدا ہوتا۔ تیر ان کے ہوتے اور قضا ان کے ساتھ اس کی لپٹی ہوتی۔ (۸:۱۷-۸) ان کے مقابلے میں نہ دشمنوں کی اکثریت ان کے کام آتی اور نہ قوت، اس لئے کہ یہ قوانینِ خداوندی کی روشنی میں قدم اٹھاتے تھے، اور وہ ان راستوں کو بھول چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر معرکہ ان کے ہاتھ میں اور ہر میدان ان کے قبضے میں ہوتا۔ اور اس طرح سے بتا دیا جاتا کہ فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ کی دعائیں کیسے مستجاب ہوا کرتی ہیں۔ اللہ کسی کی محنت ضائع نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کا وعدہ ہے، چنانچہ اس وعدے کے مطابق وہ ننھا سا پودا جو دنیا بھر کی تیز و تند مخالف ہواؤں کے جھونکوں میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا چند ہی سال کے عرصے میں ایک شجرِ طیب کی طرح یوں بڑھا، پھولا، پھلا کہ اس کی جڑیں تحت الثریٰ میں اور اس کی شاخیں اوجِ ثریا پر تھیں اور جسے دیکھ دیکھ کر اس جنتِ ارضی کا باغبان وجدِ مسرت سے جھوم اٹھتا تھا۔

محمد اللہ کے رسول، اور ان کے ساتھی کفار کے مقابلہ میں سخت آپس میں محبت والے۔ تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع کر رہے ہیں، کبھی سجدوں میں پڑے ہیں۔ اللہ کے فضل و رضا جوئی کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدات ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں۔ اور انجیل میں ہیں جیسے کھیتی کہ جس نے پہلے اپنی سوئی نکالی۔ پھر وہ درست ہو کر اوپر کو ابھری۔ پھر وہ اور موٹی ہوئی۔ پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ کہ دانے دیکھ دیکھ کر کسان کا دل مسرت سے اچھل پڑے۔ اور اس سے حاسدین جل جائیں۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالحہ کئے مغفرت اور اجرِ عظیم کا (جو) وعدہ کر رکھا تھا۔ (وہ یوں پورا ہو کر رہا)۔ (۲۸۱۲۹)

چنانچہ اللہ کے یہ صحیح مومن بندے جب بعد میں اپنی دونوں حالتوں کا موازنہ کرتے اور وہ وقت انہیں یاد آتا "جب وہ قلیل تھے۔ ملک میں کمزور و ناتواں شمار کئے جاتے تھے۔ اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ مخالف انہیں اچک کر نہ لیجائیں۔ سو ایسی حالت میں اللہ نے ان کی حفاظت کی اور اپنی مدد سے انہیں قوت دی اور ان کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں کہ وہ خدا کے شکر گذار بندے بنیں" (۸:۲۶) تو مسرت کے سجدے تھے جن کی وجہ سے حضرت عمرؓ لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کرتے کہ

یہ وادی ضجنان وہی ہے جس میں میں ایک اونی کرتا پہنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ وہ سخت مزاج آدمی تھے۔ کام لیتے تھے تو تھکا دیتے تھے۔ کم کام کرتا تھا تو پیٹتے تھے اور آج یہ حالت ہے کہ اس وادی میں میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی تیسری قوت حائل نہیں۔

لیکن یہ دور جس میں اسلام کا صحیح نصب العین، عبادات کا صحیح مفہوم، اعمالِ صالحہ کی سچی تفسیر، دنیا اور آخرت کا اصلی تعلق، قرآن کریم کا عملی نظام، اسوۂ رسول اللہ کی بین تصویر، ہر مسلمان کے سامنے تھی، بہت جلد ختم ہو گیا۔ خلافت ملوکیت سے بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت (امپیریل ازم) کی تمام خرابیاں ایک ایک کر کے اسلامی کلچر میں نمودار ہو گئیں، اور اس کی انتہا عہدِ عباسیہ میں اس وقت ہوئی جب اسلامی تعلیم کا محض قالب اسلامی تھا اور روح یکسر عجمی ہو چکی تھی۔ حکومت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت سے طبائع عافیت کوش ہو چکی تھیں۔ وہ مجاہدانہ زندگی جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اصل ایمان تھی، اب بیگار کے بھرتی شدہ، مستعار طبقہ کا کام سمجھا جاتا تھا۔ گرم جوشی کی وہ فاروقی روح، جو خالد ابن ولید کو ریشم میں ملبوس دیکھ کر تمتما اٹھتی تھی، (حالانکہ وہ میدانِ جنگ

میں تھے اور جنگی ضرورت سے انھوں نے ایسا کیا تھا) اب عہدِ کہن کا افسانہ بن چکی تھی۔ تقسیمِ عمل سے عملی برہمنیت پیدا ہو چکی تھی۔ علما کا طبقہ بجائے تیر و سنان کے، اب لفظی تاویلات کی جنگ میں مصروف تھا۔ اربابِ طریقت عجمی تصوف کے تباہ کن نظریہ کے ماتحت قوائے عملیہ کو مفلوج کر بیٹھے تھے۔ یہ سب سامانِ ہلاکت پہلے سے جمع تھے کہ شامتِ اعمال نے تاتاریوں کے حملہ کی صورت اختیار کی۔ اسلام کی مرکزی قوت فنا ہو گئی۔ اجتماعیت کی شان بگڑ گئی۔ مذہب کے علمبردار حضرات اب مختلف گوشوں اور زاویوں میں جا دبکے۔ قوتیں سلب ہو چکی تھیں، حوصلے پست ہو گئے تھے۔ دنیا ہاتھ سے نکل گئی۔ عزت و وقار کی جگہ ذلت و پستی آگئی۔ شوکت و حشمت کی بجائے ذل و مسکنت چھا گئی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، مناسک و شعائر کی شکل تو وہی تھی جو عہدِ اولیٰ میں تھی لیکن اب ان کے نتائج وہ نہ تھے جو اس وقت مترتب ہوتے تھے۔ قوموں کی تاریخیں ذہنیت کے بدلنے سے بدل جاتی ہیں اور اس قسم کے موڑ شاہراہِ حیات میں بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت نصیبہ یاوری کرتا، ہمارے اعمال کے سزا کی مدت ختم ہو جانے والی ہوتی، تو نگاہ کا رخ اس طرف جاتا کہ یہ تمام عبادات، یہ تمام اعمال، جن کی شکل اسلامی ضرور ہے، اس وقت تک حقیقی معنوں میں اعمالِ صالح نہیں ہو سکتے، جب تک ان کے نتائج اس حیاتِ ارضی میں وہی کچھ نہ ہوں جو عہد مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ میں ہوئے تھے۔ لیکن بدبختی کہ زاویۂ نگاہ الٹی طرف بدلا۔ قرآن کریم نے جہاں جہاں کامیابی، فلاح، سرخروئی، فوزِ عظیم، رزقِ کریم، حسن مآب مومنین کے لئے مخصوص کیا تھا، ان سب کو آخرت کی زندگی سے متعلق کر دیا گیا۔ اور کوئی عمل ایسا باقی نہ رکھا کہ جس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی برآمد ہو سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود عقیدہ کی شدت اور صوم و صلوٰۃ، تسبیح و تہلیل کی پابندی کے، دنیاوی زندگی روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اس وقت، بجائے اس کے کہ یوں سمجھا جاتا، کہ ان الفاظ و اعمال کی روح ان سے مفقود ہو چکی ہے اس لئے صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے، انھوں نے اپنے آپ کو یوں فریب دے لیا کہ یہ تمام "اعمال" رائیگاں نہیں جا رہے۔ البتہ ان کا نتیجہ اخروی زندگی میں برآمد ہوگا۔ غیر مسلم خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بجائے اس کے کہ ان پر رشک آتا، انھیں اپنے لٹے ہوئے سرمایہ کا غاصب سمجھتے۔ اپنے آپ کو یوں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ابتلا کی زندگی ہے، جس میں انھیں مہلت دی گئی ہے۔ اخروی زندگی میں ہم جنتِ جاودانی اور یہ جہنمِ ابدی میں جائیں گے۔ عیسائی راہبوں کا فلسفۂ ترکِ

علائق، یونانی مشائین کی حکمت ترک دنیا، ہندومت کا سنیاس، بدھ دھرم کا سنسار تیاگ، ایک ایک کرکے اسلامی کلچر میں منتقل ہوتا چلا گیا۔ لہذا ترکِ دنیا، ترکِ علائق۔ ترکِ لذائذ۔ حتیٰ کہ "ترکِ ترک" صحیح اسلامی تعلیم کے خط و خال قرار پا گئے۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں ۔۔۔ بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ تھا مجبور ۔۔۔ کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی ۔۔۔ اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

دولت کی فراوانی کے ساتھ اگر خدا فراموشی جمع ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ نظامِ انسانیت کو تباہیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسی حالت سے محترز رہنے کے لئے تاکید کی تھی کہ دیکھنا کہیں دولت و قوت ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ تمہاری منزل مقصود اس سے کہیں بلند ہے۔ اب جہاں جہاں قرآن کریم میں ایسی تعلیم تھی، اسے دنیاوی متاع و اسباب سے نفرت دلانے کے لئے بطور نص صریح پیش کرنے لگے۔ یعنی طبیب نے بڑھتی ہوئی حرارت کو روکنے کے لئے سر پر برف رکھنے کی تاکید کی تھی کہ کہیں سرسام نہ ہو جائے۔ یہ اسی برف کا استعمال فالج کے مریض پر کرنے لگ گئے۔ دنیاوی زیب و زینت کو قرآن کریم نے بالتصریح حلال فرمایا تھا۔ وہ سب حرام قرار پا گئیں۔ چیتھڑے پہننا، بھوکے رہنا، خراب و خستہ ہونا، بے گھر بے در زندگی بسر کرنا۔ "خدا کے بندوں" کی علامات متصور ہونے لگیں۔ غرضیکہ ایک ایک کرکے اس رہبانیت کی تمام باتیں جزوِ اسلام (بلکہ اصل اسلام) بن گئیں جس کو روکنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا تھا۔ اور جسے اس نے بدعت قرار دیا تھا۔ (۵۷ : ۲۷) اسلام رہبانیت کا اس لئے مخالف نہیں کہ اس سے لوگ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ اس سے ایک ایسی انفرادی نجات کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے جس کو اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اسلام، افراد کی اصلاح اس لئے چاہتا ہے کہ اس سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ قوم افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ افراد کا تزکیہ نفس ضروری ہے اس لئے کہ ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم مرتب ہوگی وہ مزکی ہو جائیگی۔ اس کے نزدیک ہر مسلمان ایک عظیم الشان مشینری کا پرزہ ہے۔ جس کی ہر حرکت اور ہر جنبش ساری مشینری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہر ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ یاقوت اور الماس کے ریخوں پر قائم ہو، خالص سونے اور چاندی کا بنا ہو۔ لیکن اس کی حرکت کا تعلق باقی پرزوں سے وابستہ نہ ہو تو اس مشینری کے لئے ایسے پرزے کا عدم اور وجود برابر ہے۔ اس کا فی ذاتہ صالح (درست) ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اگر اسلام کا نصب العین ایسی انفرادی اصلاح ہی ہوتا تو رسول اللہ اور صحابہ کبار

کو غاروں میں چھپ کر نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے سے تو کوئی نہیں روکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ایک ذہنیت کے بدل جانے سے اس تمام تعلیم کی روح بدل گئی اور عبادات کا مفہوم اسی قسم کی انفرادی اصلاح سمجھ لیا گیا جسے اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ تمام عالم اسلامی میں اس عجمی ذہنیت کے مہلک جراثیم پھیل گئے اور آہستہ آہستہ اسلام کی تمام شوکت وحشمت، ذلت و مسکنت میں بدلتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ آج حالت یہ ہے کہ وہی قوم، جس کے نزدیک خدا کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر کے مترادف تھا، یاس و حرماں کا مجسمہ بن کے رہ گئی ہے اور چونکہ دینی تعلیم جو اس واماندگی، ضعف و ناتوانی، پریشانی و پراگندگی کے عالم میں وضع ہوئی تھی، اصل اسلام بن چکی ہے، لہذا عوام تو اسی نشے میں مست ہیں کہ یہاں جس قدر ہو سکے تباہ حال ہو جائیں، جونہی آنکھیں بند ہوئیں اور ہم جنت جاودانی میں جا بیٹھے۔ اور جنہیں مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہے وہ یہ سمجھ کر کہ یہ سب ان کے دین کا نتیجہ ہے۔ اسلام سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ دین کے علمبرداروں کو شکایت ہے کہ لوگ بے دین ہوتے جا رہے ہیں، اور بے دینوں کو شکوہ ہے کہ یہ دین داران کی دنیا بھی تباہ کر رہے ہیں۔ "مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" اور نمازیوں کو گلہ ہے کہ ان اماموں میں "وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے"۔ لہذا ان دونوں میں ایک ایسی حدِ فاصل، ایک ایسی گہری خلیج حائل ہو چکی ہے کہ دونوں اپنے اپنے شعبوں کو، دین اور دنیا کو، ناقابلِ اتصال سمجھ کر ایک دوسرے سے الگ ہو بیٹھے ہیں۔ حامیانِ دین نے اسی وجہ سے دین کو غریبوں تک محدود کر دیا ہے کہ وہاں ابھی ان کی عزت باقی ہے۔ مسلمان غرباء کے طبقہ کی حالت آج خون کے آنسو رلا دینے والی ہو چکی ہے۔ لیکن "دین" کی تمام خدمات کا بوجھ اسی غریب و نادار طبقہ کے سر پر ہے۔ مولوی آتا ہے اور اپنا خمس وصول کر کے اسے عذابِ قبر اور نارِ جہنم سے بچنے کی دعائیں سکھا جاتا ہے۔ شیخِ طریقت اپنا ٹیکس لے کر اسے نماز اور ذکر خفی و جلی سے روحانیت بڑھانے کا "صراطِ مستقیم" دکھا جاتا ہے۔ واعظ آتا ہے تو قرآن کریم کے رزقِ کریم اور حیاتِ طیبہ کے وعدوں کو عاقبت پر اٹھا کر اسے تھپک تھپک کر سلا جاتا ہے کہ یاد رکھو وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ میں نے ایک بہت بڑی مسجد میں جمعۃ الوداع کے وعظ میں خود سنا کہ امام آخر الزماں کا ظہور اس وقت ہوگا جب مسلمانوں کا زوال و انحطاط اپنی انتہائی حالت کو پہنچ جائے گا۔ چاروں طرف سے مایوسی کی گھٹائیں ان پر چھا جائیں گی، امید کی کوئی کرن باقی نہ رہے گی۔ اگر اس وقت تک امام صاحب نے نقاب نہیں اٹھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی مسلمانوں کا زوال آخری حد تک نہیں پہنچا۔ جس وقت مسلمانوں کی تباہ حالی اس آخری حد تک پہنچ جائے گی تو آنے والا آئے گا اور تمام روئے زمین پر مسلمانوں کی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔" جو لوگ کچھ آسودہ

حال ہیں اُن پران محافظینِ دینِ متین اور حامیانِ شرعِ مبین کی نظرِ کرم اور قسم کی ہے۔ آئے دن آپ کو ایسے اشتہارات چسپاں نظر آئیں گے کہ "ایک ہزار روپیہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو یہ ثابت کر دے کہ نماز میں آمین بالجہر نہیں کہنی چاہیئے"۔ ان مقتدیانِ دین نے اپنے اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ معتقدین کا حلقہ گرد ہوتا ہے۔ ہزاروں روپے ایسے ہی مجادلات و مباحثات میں صرف کرا دیئے جاتے ہیں، جماعتِ مخالف کے ائمہ و مشائخ، علماء و اسلاف کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ مقدمے چلتے ہیں دونوں اطراف سے ہزارہا روپیہ ضائع ہو جاتا ہے۔ دینے والے اسے "فی سبیل اللہ" سمجھ کر جنت کے خریدار بنتے ہیں۔ لینے والے اپنے جہادِ کبیر کا صلہ سمجھ کر لیتے ہیں اور پھر احسان بھی رکھتے ہیں۔ حالانکہ غور سے دیکھیے کہ اللہ نے اس سلسلہ کائنات کو ایک عظیم الشان مقصد کے لئے تخلیق کر کے اسے انسان کے لئے مسخر کر دیا۔ پھر ان انسانوں میں سے امتِ مسلمہ کو خیرِ امت کہہ کر اس مقصد کی تحصیل کے لئے انھیں چن لیا۔ تو کیا وہ مقصدِ عظیم، وہ نصب العین جو فاطرِ کائنات نے اس اجتبار و انتخاب کے اندر مضمر رکھا تھا، اس کا حصول، اس کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ نماز میں آمین آہستہ کہنی چاہیئے یا بآوازِ بلند، ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا زیرِ ناف۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ دراصل قصور ان کا بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس چیز کو اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے اور جن اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے، ان کی بنیاد غلط ہے۔ فلاح و سعادت کو محض اخروی زندگی کے ساتھ مخصوص کر دینے سے مطلب ہی یہی ہے کہ اعمال کو نتائج کے اعتبار سے نہ پرکھا جائے بلکہ محض نظری لحاظ سے پرکھا جائے۔ یعنی ایمان و اعمالِ صالح کی پہچان حسنِ مآب، نیک انجام، کامیاب زندگی، حیاتِ طیبہ، استخلاف فی الارض نہ ہو، بلکہ ان کی سند اس قسم کے سرٹیفکٹ ہوں جو مصری خلفاء کے عہد میں ہر مسلمان کو اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی شہادت میں اپنی جیب میں رکھنے پڑتے تھے۔ قصور سارا اس ذہنیت کا ہے اور جب تک یہ ذہنی تخیل نہیں بدلتا کوئی تبدیلی کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

نوعِ دیگر میں جہاں دیگر شود   ایں زمین و آسماں دیگر شود

آپ اس طبقہ کو چھوڑیئے جو اسلامی مناسک و عبادات پر عامل نہیں۔ اس طبقہ کو دیکھیے جو ان عبادات پر کاربند ہے۔ ان کی دنیاوی حالت کیسی ہے؟ قرآن کریم نے ان ہی لوگوں کو کامیاب کہا تھا قد افلح المومنون (۲۳:۱-۱۱) انہی کے لئے آیا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ روز بروز بجائے افلح واصلح ہونے کے، ناکام و نامراد ہوتے جا رہے ہیں؟ کیا محض اس لئے نہیں کہ یہ کامیابی یہ فلاح و صلاح "محض آخرت" سے منسلک کر دی گئی ہے؟ قرآن کریم نے کہا تھا:۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷:۲)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالح کئے یعنی ایمان لائے اس پر جو محمد پر نازل کیا گیا ہے جو حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔ ان سے ان کی برائیاں دور کرکے ان کی حالت کو بہترین بنا دیا جائیگا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جسے "صالح" کہا جاتا ہے اس کی زندگی انتہائی قابلِ رحم گذر رہی ہے۔ کبھی سوچا بھی کہ یہ کیوں ہے؟ لیکن ان حضرات کو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو یہ فریب دے رکھا ہے کہ حالت کی بہتری کا مقام صرف حیاتِ آخرت ہے، یہ دنیا نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا ۔۔۔ جو آج جگر سوز و دل افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا ۔۔۔ جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

قرآن کریم میں ہے:-

بد اعمال لوگ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کئے کہ ان سب کا مرنا اور جینا، حیات و ممات یکساں ہو جائے یہ بہت برا فیصلہ ہے۔ (جو یہ کئے بیٹھے ہیں)۔ (۲۱:۴۵)

یعنی قرآن کریم کی رو سے ایک مومن و صالح کی زندگی، ایک بد اعمال کی زندگی کے برابر نہیں بلکہ متمیز اور ذی شان ہونی چاہئے۔ یہ خدائے تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اور جو اس کے خلاف سمجھے وہ سراسر غلطی و گمراہی پر ہے۔ لیکن کیا واقعی آج ان کی زندگی، جنھیں مومن و صالح کہا جاتا ہے، بد اعمال کفار کے مقابلہ میں امتیازی زندگی ہے؟ واقعات تو اس کے خلاف بتا رہے ہیں۔ قرآن کریم نے تو اعمال و ایمان کے صلہ میں، رزقِ کریم، عزت و آبرو کی کسوٹی (۵۰:۲۲) دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر آج یہ کیوں ہے، کہ سب سے زیادہ ذلت و رسوائی کی روٹی مسلمان کو مل رہی ہے۔ یہ محض "زیبِ داستان" نہیں۔ بلکہ ٹھوس حقیقت ہے کہ آج محض روٹی کی خاطر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے ذلت و خواری کی وہ منازل طے کرنی پڑتی ہیں جن کے تصور سے شرافت کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری یہ زبوں حالی اس لئے ہے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ رکھا ہے۔ بجا اور درست۔ لیکن اس "اسلام چھوڑنے" کی تفصیل کیا ہے؟ صرف اس قدر کہ لوگ انگریزی پڑھ گئے ہیں داڑھی منڈانے لگ گئے ہیں۔ ان کے ٹخنے ڈھکے ہوئے ہیں۔ وغیرہ ذالک۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے یہ سب انداز درست اور صحیح ہیں، جو آپ کے معیار کے مطابق "پکے مومن" ہیں، وہ کونسی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ آپ جس طرح جی چاہے اپنے آپ کو خوش کر لیجئے۔ لیکن یہ ساری خرابی اس

نظریئے کی ہے جو اسلام کے ضعف و انتشار کے زمانے میں پیدا ہوا۔ اور جس کی رو سے مسلمان کو مسلمان ہونا تو ایک طرف انسان ہونا بھی نصیب نہ ہو سکا۔ اس تمام خرابی کا ایک اور صرف ایک علاج ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو جگا جگا کر جھنجوڑ جھنجوڑ کر بتایا جائے کہ یاد رکھو دنیا کی ذلت و خواری خدا کا عذاب ہے۔ یہاں کی شوکت و حشمت کی زندگی عین اسلامی زندگی ہے۔ مسلمان دنیا میں ایک امتیازی زندگی بسر کرنے آیا ہے۔ عزت و وقار، جاہ و سطوت، سربلندی و سرفرازی، اس کے اعمال صالح کے لازمی نتائج ہونے چاہئیں۔ جو اعمال ایسے نتائج پیدا نہیں کرتے ان کی صورت اسلامی ہو تو ہو ان کی روح ہرگز اسلامی نہیں۔ جو یہاں ذلیل ہے اور اس ذلت پر قانع ہے وہ آخرت میں معزز نہیں ہو سکتا۔ جو اپنی موجودہ زندگی نہیں سنوار سکتا اور اس رسوائی میں مطمئن ہے اس کی عاقبت کبھی نہیں سنور سکتی۔

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷:۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

یقین مانیئے کہ اس تعلیم کی اشاعت میں آپ کی سخت سے سخت مخالفت ہوگی۔ معتقدات کا چھڑانا افیون چھڑانے سے کم نہیں ہوتا۔

گرفتم حضرتِ ملا ترش روست   نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم   مرا از کعبہ می راند حق اوست

لیکن اگر آپ کو تسلیم ہے کہ یہ تبدیلی از بس لابدی ہے تو کسی مخالفت کی پرواہ نہ کیجئے۔ کہیئے اور برملا کہیئے۔ برادر توان گفت بہ منبر نتواں گفت۔ ایک دفعہ اس "اسلامی رہبانیت" کے اعتقاد کو توڑ دیجئے اور صحیح اسلامی تعلیم سامنے لے آیئے۔ پھر دیکھئے کہ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری زکوتیں وہی نتائج پیدا کرتی ہیں یا نہیں جو ایک مومن کی اس دنیا کی زندگی کے خصوصی امتیازات ہیں۔ اور آخرت کا تو پھر پوچھنا ہی کیا۔ جب خدا کی کتاب زندہ ہے، اس کے اندر اس کے رسول کا اسوۂ حسنہ زندہ ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس پر عمل کرنے والی قوم دنیا میں زندہ نہ ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہی اس قوم کو ہے کہ بقا للاصلح قانون فطرت ہے۔ اور اس قوم کا ہر عمل، عمل صالح ہے جو اس کے اندر زندہ اور پائندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے۔ اقوام مغرب نے فطرت کے اسی اصول کو۔ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کو بھانپ لیا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چند دنوں میں جو نتائج برآمد ہوگئے ظاہر و باہر ہیں۔ لیکن ان کی بدبختی کہ وہ اپنے نظام زندگی کو مستقل اقدار کے تابع نہ رکھ سکے۔ اس لئے ان کا نظام "انسانیت" کے لئے ممد حیات

ہونے کے بجائے وجہِ ہلاکت بن گیا۔ لیکن بایں ہمہ انھیں وہ قوتیں تو حاصل ہو گئیں جن کی وجہ سے آج تمام دنیا کے مسلمان ان کے رحم وکرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ناپائیداری ہی تسخیرِ فطرت تو ہوئی۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے اس غلط اعتقاد سے تو ان کی یہ حالت ہو گئی کہ

قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

اگر ان کے اعمال کہیں حقیقی معنوں میں اعمالِ صالحہ ہو جاتے تو پھر اس جنتِ ارضی کا پوچھنا ہی کیا۔ فی حیثیتہ راضیہ۔ ایسی جنت کہ جس میں اس جہنم کا گذر ہی نہ ہو جس میں یورپ آج گزر رہا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کے مطابق ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض یعنی اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے، استبداد و ملوکیت کی لعنت نہیں جس میں آج مسلم و غیر مسلم، سب حکومتیں گرفتار ہیں۔

یاد رکھئے! جس ایمان و عمل صالح کا جیتا جاگتا، زندہ و پائندہ نتیجہ، اس دنیا میں "خدا کی بادشاہت" کا قیام نہیں، یعنی جماعتِ مومنین کا استخلاف فی الارض نہیں، ضابطۂ الٰہی کے مطابق جہانبانی و جہاں رانی نہیں، وہ ایمان قرآنی ایمان نہیں، وہ اعمال اسلامی اعمال نہیں۔ انھیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے، نگاہ کا پھیر ہے۔ مسلمان کے لئے ایمان و اعمالِ صالح کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے، باقی سب فریبِ نظر ہے۔ ابلیس کے دھوکے ہیں۔

زفتراں پیشِ خود آئینہ آویز　　دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را　　قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

ماہنامہ البیان لاہور

امرتسر (مرحوم) کی تبلیغی جماعت امت مسلمہ کا مشہور تبلیغی صحیفہ "البیان" اپنی قدیم روایات اور وقت کے نئے تقاضوں کے ساتھ ستمبر ۱۹۴۹ء سے لاکر شائع ہو رہا ہے۔ پرانے احباب اپنے نئے پتوں سے اطلاع دیں ـــــ انسانوں کے خودساختہ، روایتی مذاہب سے اکتائے ہوئے، کرشمہ جی کے پیاسے اور دین و دانش کا حقیقی مقام سمجھنے کے مشتاق مسلمان "البیان" میں قلبی تسکین اور بقائے پاکستان کا سامان پائیں گے۔ قیمت فی پرچہ ۸/ ـــ سالانہ پانچ روپے۔

مینیجر البیان ۴۰ نسبت روڈ۔ دارالقرآن۔ لاہور

ترسیل زر کا پتہ۔ ڈاکٹر غلام نبی غلام حسن۔ ۴۴ نسبت روڈ۔ لاہور

وضع حدیث

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ "جو شخص میرے اوپر قصداً جھوٹ بولے وہ جہنم کو اپنا ٹھکانا بنا لے"۔ یہ حدیث اتنے صحابہؓ سے مروی ہے کہ بعض بعض ائمہ حدیث نے اس کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے، لیکن باوجود اس وعید کے بھی ایسے لوگ تھے جو اسی زمانے سے جھوٹی حدیثیں گھڑنے لگے۔ ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں امام طبرانی کی اوسط اور ابن عدی کی کامل کے حوالے سے لکھا ہے کہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر جو بنی لیث ہیں کسی شخص نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا، جس کو اس عورت کے سرپرستوں نے نامنظور کر دیا۔ وہ شخص حلۂ نبویؐ کے مشابہ ایک لباس پہن کر وہاں گیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حلہ عطا فرمایا ہے اور اختیار دیا ہے کہ میں تمہاری عورتوں کے بارے میں جو چاہوں حکم دوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ کا فرمانا سر آنکھوں پر۔ یہ کہہ کر اس کو ایک مکان میں ٹھہرایا اور اپنے دو آدمی تصدیق کے لئے دربارِ رسالت میں بھیجے۔ آنحضرتؐ سن کر نہایت برہم ہوئے اور ایک انصاری کو حکم دیا کہ جا کر اس کو قتل کر کے آگ میں جلا دو۔ جب وہ انصاری پہنچے تو دیکھا کہ سانپ کے کاٹ لینے سے وہ مر چکا تھا۔ انہوں نے اس کی لاش کو آگ میں جلا دیا اور واپس چلے آئے۔

شیخ طاہر جزائری اپنی کتاب توجیہ النظر الیٰ اصول الاثر کے صفحہ ۲۴۹ میں لکھتے ہیں۔

وقد کذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو حی وقد کان فی عصر الصحابۃ منافقون ومرتدون

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی زندگی ہی میں جھوٹ بولا گیا اور زمانہ صحابہؓ میں منافقین و مرتدین تھے۔

عہدِ صحابہؓ صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئا غیرہ فلیمحہ۔

مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اس کو مٹا ڈالے۔

علماء نے اس کی توجیہ یہ لکھی ہے کہ قرآن کی حفاظت کے لئے یہ حکم دیا تاکہ کوئی دوسری چیز اس کے ساتھ

خلط ملط نہ ہو جائے، لیکن درحقیقت یہ وجہ نہ تھی، ورنہ آپ یہ حکم دیتے کہ قرآن کو الگ لکھو اور روایتوں کو الگ۔ بلکہ مقصد اس ممانعت کا یہ تھا کہ لوگ روایات میں نہ پڑجائیں، کیونکہ جب روایت کا سلسلہ چلتا ہے تو سچ کے ساتھ جھوٹ بھی پھیلنے لگتا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۂ اول ہی کے عہد میں لوگ روایتوں میں اختلاف کرنے لگے اور جب انھوں نے دیکھا تو لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم روایات میں اختلاف کرتے ہو، ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو[۱]۔

حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعۂ احادیث بھی لکھا تھا جس میں تقریباً پانچ سو حدیثیں تھیں، مگر آخر میں اس کو حضرت عائشہؓ سے لے کر آگ میں جلا دیا، کیونکہ ان کو خیال ہوا کہ ممکن ہے میں نے کسی کو معتبر سمجھ کر کوئی روایت اس سے لکھ دی ہو اور درحقیقت وہ معتبر نہ ہو[۲]۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس مجموعہ میں جملہ حدیثیں ایسی ہی تھیں کہ انھوں نے لوگوں سے سنکر لکھی تھیں، کیونکہ وہ خود دربار رسالت کے رُکن رکین تھے اور اپنے کان سے آنحضرتؐ کی باتیں سنتے تھے، جن میں ان کو شبہ کی گنجائش نہ تھی، لیکن چونکہ روایات میں اختلاف اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور امت کو بہ حیثیت خلیفہ اسلام ہونے کے انھوں نے اس سے روک دیا تھا، اس لئے خود بھی پسند نہ کیا کہ روایات کا مجموعہ چھوڑ جائیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ نے بھی کچھ فرمودۂ نبویؐ اپنے پاس لکھ رکھا تھا، لیکن یہ مجموعہ بھی کسی کو نہ ملا۔ معلوم نہیں کہ ضائع ہو گیا یا انھوں نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی طرح اس کو جلا دیا۔

ساری آفت منافقوں کی وجہ سے تھی جو سنتے کچھ تھے اور بیان کچھ کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کے بعد عہد صحابہ میں منافقین کے ساتھ مرتدین کی بھی جماعت تھی۔ اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے روایت حدیث کی ممانعت کی اور بعض بعض معتمد صحابہ نے جو روایتیں کیں، ان پر شہادت طلب فرمائی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد میں اور بھی سختی کی اور لوگوں کو روایت میں پڑنے سے منع فرمایا۔ اگر کوئی روایت بیان کرتا تو جب تک اس کے گواہ نہ لے لیتے نہ چھوڑتے۔ لیکن باوجود اس کے روایتیں پھیلیں اور کچھ لوگ اگر سچی روایتیں بیان کرنے والے تھے تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جھوٹ گھڑنے لگے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ بشیر بن کعب نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بشیر نے کہا کہ کیا بات ہے جو آپ میری حدیثیں نہیں سنتے۔ فرمایا کہ

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ذکر ابی بکر۔ [۲] تذکرۃ الحفاظ۔

کبھی وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بیان کرتا تو ہم جھپٹ کر اس کی طرف بڑھتے اور کان لگا کر سنتے۔ مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں شروع کیں۔ اس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

یہی وجہ تھی کہ اکثر صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم نے حدیثیں بیان کرنی چھوڑ دی تھیں۔ حضرت زید بن ارقم سے ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ کوئی حدیثِ رسول سنائیے۔ انھوں نے کہا کہ ہم بوڑھے ہو گئے اور بھول گئے۔ حضرت زبیرؓ سے ان کے بیٹے عبداللہ نے فرمائش کی کہ آنحضرتؐ کی کوئی حدیث بیان کیجئے انھوں نے بھی اسی طرح کا جواب دیا۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں حضرت سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ سے مکہ تک گیا، مگر ایک روایت بھی نہ سنی۔ امام شعبی کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں ایک سال تک رہا، لیکن انھوں نے کوئی حدیث بیان نہ کی۔

زمانہ مابعد عہد صحابہ کے بعد سے کذابین اور وضاعینِ حدیث کی کثرت بڑھتی گئی۔ علامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق اس کے اسباب حسب ذیل تھے:۔

۱۔ بعض لوگوں نے جن کے اوپر زہد غالب تھا حفظ میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے۔

۲۔ بعض اہلِ علم کی یادداشتیں ضائع ہوگئیں اور انھوں نے مجبوراً حافظہ سے روایت کی اور جو خیال میں آیا کہہ گئے۔

۳۔ بہت سے ثقہ راویوں نے بھی جن کی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دیدیا تھا غلط روایتیں کیں۔

۴۔ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے سہواً غلط روایت کی اور بعد میں باوجود اپنی غلطی کے علم کے بھی اس سے رجوع کرنا شان کے خلاف سمجھا۔

۵۔ زنادقہ نے شریعت کو مٹانے کے لئے جھوٹی حدیثیں گھڑیں۔

۶۔ جب مذہبی تفریق پیدا ہوگئی اور سنی، شیعہ، خارجی، قدری، جہمی، مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بن گئے، اس وقت ہر ایک فرقہ کے لوگوں نے دوسروں کے مقابلہ کے لئے اپنی اپنی تائید میں حدیثیں وضع کیں۔

۷۔ بہت سے عابد اور زاہد لوگ ایسے تھے کہ عوام کو کسی اچھے کام کی رغبت دلانے اور بُرے کام سے ڈرانے کے لئے حدیثیں گھڑتے تھے۔ ابن جوزی کے بیان کے مطابق یہ لوگ شریعت کو نامکمل سمجھتے تھے، جس کی تکمیل ان روایات سے کرتے تھے۔

۸۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ ہر پسندیدہ قول کیلئے اسناد ترتیب دے لینا اور اس کو رسول اللہؐ تک پہنچا دینا جائز ہے۔

۹۔ سلاطین کے مقربین اور حاشیہ نشین ان کے حسب منشا روایتیں گھڑتے اور ان کو اپنے تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔

۱۰۔ قصہ گو، واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آں حضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرتے تھے، کیونکہ ان کی گرم بازاری کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ وہ دس وجوہ ہیں جن کے باعث مکذوب و مجہول روایتیں مسلمانوں میں پھیلیں۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر سیاسی جماعتوں نے جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخر کرنا چاہتی تھیں، حدیثیں بنائیں اور مشرق سے مغرب تک ان کو پھیلایا اور ان سے بھی زیادہ ان لوگوں نے جو اپنے علم اور تقدس کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھانا چاہتے تھے، نئی نئی حدیثیں وضع کیں۔

شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ ایک محدث نے آخر عمر میں توبہ کی۔ اس وقت اس نے لوگوں سے کہا کہ ذرا دیکھ بھال کر حدیثوں کو قبول کیا کرو، کیونکہ ہم لوگ جب کسی بات کو اپنے حسب منشا دیکھتے تھے تو اس کو حدیث بنا لیتے تھے۔ (یعنی رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیتے تھے)

ان واضعین میں کچھ لوگ ایسے تھے جو مخفی طور پر جھوٹی حدیثیں اپنی جماعت میں پھیلاتے تھے۔ اگر ان کا پایۂ اعتبار کم ہوتا تھا تو بڑے بڑے بزرگوں کے ناموں سے ان کو روایت کرتے تھے۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ اپنے شیوخ کو غافل پا کر دسیسہ کاری سے اپنے مجعولات ان کی کتابوں میں درج کر دیتے تھے۔

اور کچھ لوگ علی الاعلان مکذوب روایتیں بیان کرتے تھے، کوئی تو اپنی گرمیٔ بازار کے لئے اور کوئی ثواب اور جہاد سمجھ کر۔ چنانچہ نوح بن ابی مریم نے قرآن کی ایک سورۃ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں، جن کو مفسرین اور خاص کر بیضاوی نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔ جب ائمہ حدیث نے ان کی تحقیق شروع کی تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے یہ حدیثیں خود بنائی ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔ یہی حال اکثر ان رواۃ کا تھا جنھوں نے ترغیب یا ترہیب کی حدیثیں روایت کی ہیں۔

واعظین اور قصہ گو تو نہایت بے باکی اور جرأت سے کام لیتے تھے۔ موضوعات کبیر میں ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ نے مسجد رصافہ میں نماز پڑھی۔ وہاں ایک واعظ نے بیان کرنا شروع کیا کہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے عبدالرزاق سے، انھوں نے معمر سے، انھوں نے قتادہ سے، انھوں نے حضرت انسؓ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اس کلمہ کے ہر ہر حرف سے ایک ایک پرندہ

لہ حدیث کے امیرالمومنین بسے جاتے ہیں اور ائمہ جرح و تعدیل میں ممتاز ہیں۔

پیدا کرتا ہے، جس کی چونچ سونے کی ہوتی ہے اور پر زمرد کے " آخر تک تقریباً بیس ورق کی حدیث بیان کی۔ اس طویل داستان کو سن کر ان دونوں نے آپس میں ایک دوسرے کو حیرت کے ساتھ دیکھا۔ اس کے بعد یحییٰ بن معین نے واعظ کو اپنی طرف بلایا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سنی ہے۔ اس نے کہا احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے۔ انھوں نے کہا کہ میں یحییٰ ہوں اور یہ احمد بن حنبل۔ ہم دونوں میں سے کسی نے آج سے پہلے اس روایت کو سنا تک نہیں تھا۔ تم کو اگر جھوٹ ہی بولنا تھا تو ہمارے سوا کسی اور کا نام لیا ہوتا۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے، آج تحقیق ہو گئی۔ پوچھا کہ یہ کیونکر، بولا کہ سترہ یحییٰ بن معین ہیں اور سترہ احمد بن حنبل، جن سے میں نے روایت کی ہے، یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ دنیا میں ایک اکیلے تمہیں یحییٰ بن معین ہو۔ یہ سن کر انھوں نے آستین منہ پر رکھ لی اور چپ چاپ چلے آئے۔

محمد بن عبداللہ کا قصہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اس نے موصل میں بیٹھ کر عجیب غریب حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ علماء کو جب اس کی خبر ہوئی تو ان میں سے چند نے ارادہ کیا کہ جا کر اس کی تردید کریں۔ وہ مجمع میں سرگرم تقریر تھا۔ اس نے جب علماء کو آتے دیکھا تو معاملہ سمجھ گیا، فوراً حضرت جابرؓ سے ایک روایت بیان کرنی شروع کی کہ " قرآن کلام اللہ ہے اور غیر مخلوق[1]"۔ اب عوام کے خوف کر ان علماء کو جرأت نہ ہو سکی کہ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہیں۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں امام شعبی[2] کا بیان نقل کیا ہے کہ " میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے لگا۔ اس میں ایک دراز ریش واعظ کھڑا ہوا تقریر کر رہا تھا۔ اس نے اسناد کے ساتھ یہ روایت بیان کی کہ اللہ تعالیٰ نے دو صور پیدا کئے ہیں ہر ایک دو دو بار پھونکا جائے گا۔ میں نے جلدی سے نماز ختم کر کے کہا کہ اے شخص اللہ سے ڈر اور جھوٹی حدیثیں نہ بیان کر صور تو صرف ایک ہی ہے۔ اس نے کہا کہ کیسا فاجر آدمی ہے جو بڑے بڑے بزرگوں کی روایت کو جھٹلاتا ہے۔ اس کی زبان سے یہ نکلنا تھا کہ عوام مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے اور جب تک مجھ سے اقرار نہ لے لیا کہ اللہ تعالیٰ نے تیس صور پیدا کئے ہیں، اس وقت تک نہ چھوڑا۔

ائمہ حدیث نے جب تنقید شروع کی تو ان واضعین و ضعفاء کے تراجم جمع کر کے کتابوں میں مدون کئے۔ چنانچہ حدیث میں سے علم الضعفاء والوضاعین بھی ایک اہم علم بن گیا جس میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ چند مشہور کتب یہ ہیں:

---

[1] اس زمانے میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جو عالم قرآن کو غیر مخلوق کہہ دیتا، عوام میں مقبول ہو جاتا۔ پھر اس کی کوئی بات قابلِ تردید نہ خیال کی جاتی۔ [2] تابعین میں بڑے پایہ کے امام ہیں۔ حجاج کے زمانہ میں کوفہ میں تھے۔

کتاب الضعفا	امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ
"	ابو عبد اللہ برقی متوفی ۳۲۹ھ
"	ابو اسحٰق جوزجانی متوفی ۲۵۹ھ
"	ابو جعفر عقیلی متوفی ۳۲۳ھ
"	ابو نعیم استر آبادی متوفی ۳۲۳ھ
"	ابو الفتح محمد متوفی ۳۷۴ھ
"	ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ (یہ کتاب کامل کے نام سے مشہور ہے اور ۱۲ جلدوں میں ہے)
"	ابن ابی حاتم (چھ جلدوں میں)

کثرتِ موضوعات | جب وضاعین کی اس قدر کثرت تھی کہ ان کے تراجم بارہ بارہ جلدوں میں لکھے گئے، تو ظاہر ہے کہ موضوع احادیث کی کس قدر کثرت ہوئی ہوگی۔ عقیلی کا قول ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں نقل کیا ہے کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں۔ تذکرۃ الموضوعات میں شیخ محمد طاہر گجراتی لکھتے ہیں کہ جوئباری، ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار سے زیادہ حدیثیں بنائیں۔ ابن ابی العوجاء کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب اس کو قتل کرنے کے لئے لے گئے، تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا رکھا ہو۔ روایات کا تو کیا ذکر ہے، بعض بعض وضاعین نے پوری پوری کتابیں روایات کی تصنیف کر ڈالیں، جو اول سے آخر تک غلط تھیں۔ تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۹ میں ہے۔

> کتب حدیث میں بعض کتابیں ایسی ہیں کہ ان کی جملہ روایات موضوع ہیں۔ من جملہ ان کے القضاعی کی کتاب ہے۔ پھر اربعون ودعانیہ۔ ان دونوں میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔ "وصایا علی" نامی کتاب میں بھی بجز پہلی حدیث کے باقی سب غلط ہیں۔ انس بصری کی مسند جو تین سو حدیثوں کا مجموعہ ہے سرتا سر غلط ہے۔ ابن عدی نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن جعفر نے اپنے آباء کی روایت سے جو حضرت علیؓ تک پہنچائی گئی تھی ایک کتاب نکالی جو ہزار حدیثوں کا مجموعہ تھی۔ اس کی تمام حدیثیں سن کر دارقطنی نے کہا کہ یہ کتاب "علویات" جھوٹ اور افترا کا مجموعہ ہے۔ اللہ اس کے واضع پر لعنت کرے۔ اس نے جماع اور طریقۂ جماع کے متعلق بھی حضرت علیؓ کے نام سے وصیتیں روایت کی ہیں۔
>
> دیلمی نے لکھا ہے کہ ابوالفضل جعفر بن محمد حسینی کی کتاب العروس منکر اور غیر معتبر ہے اور امام

ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن اسحٰق بن ابراہیم نے اپنے باپ اور دادا کی روایت سے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو ہرگز اس قابل نہیں کہ اس سے حجت پکڑی جائے۔

کتب موضوعات | جب احادیث کی پڑتال شروع کی گئی، اس وقت ائمہ جرح و تعدیل نے جہاں کذابوں کا پتہ لگانے کی کوشش کی، وہاں ان کی روایتیں بھی چھانٹ کر نکالتے گئے اور جو ان کے نزدیک حتمی طور پر موضوع ثابت ہو گئیں، ان کے مجموعے تیار کر دیئے۔ ان میں سے جو کتابیں مشہور ہیں، وہ ذیل میں درج کرتا ہوں:

کتاب الاباطیل	ابو عبداللہ الحسین ہمدانی متوفی ۵۴۳ھ
الموضوعات الکبریٰ	ابو الفرج عبدالرحمٰن بن جوزی متوفی ۵۹۷ھ (چار جلدوں میں ہے)
مختصر الموضوعات	امام سفارینی
اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ	جلال الدین سیوطی
تذکرۃ الموضوعات	شیخ محمد طاہر گجرات پاک پٹن کے مشہور ہندی محدث مقتول ۹۸۶ھ
رسالتان فی الموضوعات	رضی الدین صغانی متوفی ۶۵۰ھ
الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ	شیخ ابو عبداللہ محمد شامی متوفی ۹۴۲ھ
"	امام شوکانی یمنی متوفی ۱۲۵۵ھ
کتاب المغنی	حافظ ضیاء الدین موصلی متوفی ۶۲۳ھ
الموضوعات الصریحہ	عمر بن بدر
الکشف الالٰہی	محمد سندروسی متوفی ۱۱۷۷ھ
تذکرۃ الموضوعات	ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ
اللؤلؤ المرصوع	محمد بن خلیل قاوقجی متوفی ۱۳۰۵ھ

ان وضاعین اور موضوعات سے حدیث پر ایسی آفت آئی جس کا اندازہ مشکل ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک تھی اور حدیثیں بھی جو آپ سے روایت کی گئی ہیں، ان کا ۹۹ فی صدی حصہ مدنی زندگی سے متعلق ہے، جس کی کل مدت دس سال ہے اور ادھر وضاعین وکذابین کی ایک بے شمار فوج ہو گئی جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی تھی بلکہ ان میں سے بعض کا پیشہ ہی تھا۔ ان ہزاراں ہزار وضاعین نے لاکھوں حدیثیں وضع کر ڈالیں اور ان کو پھیلا دیا۔ اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلاشبہ صحیح تھیں، اس طرح مخلوط ہو گئیں کہ بڑے

بڑے نقادوں کیلئے یہ مشکل ہوگیا کہ اس دریائے کذب سے سچائی کے قطروں کو چن سکیں۔

تنقید حدیث | ائمہ حدیث نے جب حدیثوں کو پرکھنا شروع کیا اور صحیح اور غلط کو الگ الگ کرنے لگے اس وقت دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک خود حدیث کو، دوسرے رواۃ کو۔

موضوع حدیث کی شناخت کیلئے انھوں نے حسب ذیل اصول قرار دیئے

۱. صحیح تاریخ کے خلاف ہو۔

۲- رافضی صحابہ کے یا خارجی اہلبیت کے مطاعن میں روایت کرے۔

۳- حدیث میں ایسا واقعہ ذکر کیا جائے جس کے بیان کرنے والے بہت سے ہو سکتے ہوں مگر صرف ایک ہی شخص روایت کرتا ہو۔

۴- قرآن کے خلاف پڑے۔

۵- عقل صحیح کے خلاف ہو۔

۶- چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے عذاب کی وعید ہو۔

۷- قرینہ یا موقع کے خلاف معلوم ہوتی ہو۔

لیکن ان اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ جو لوگ جھوٹی حدیثیں تراشتے تھے وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے تاکہ کوئی گرفت نہ کر سکے چنانچہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود بڑے بڑے قانون دانوں کی جرح کے بھی جھوٹے گواہ اپنی شہادتوں میں پورے اتر جاتے ہیں اور کبھی کبھی سچے گواہوں سے زیادہ قابل اعتبار قرار پا جاتے ہیں۔ لہذا یہ اصول جو غلط روایتوں کی پہچان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، تقریباً بےکار رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ائمہ جرح و تعدیل نے دوسری چیز یعنی رواۃ کی ثقاہت پر زیادہ دارومدار رکھا، لیکن مشکل یہ ہے کہ ثقاہت ایک باطنی وصف ہے۔ اس کے تمیز کی بنیاد کس پر رکھی جائے۔ رہا ظاہری تقوی اور طہارت تو اس کی بابت خود محدثین کا تجربہ بہت تلخ ہے۔ یحیی بن سعید القطان جو جرح و تعدیل کے عظیم الشان امام ہیں کہتے ہیں کہ اہل صلاح و خیر سے زیادہ حدیث کے معاملہ میں کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ امام مسلم کا قول ہے کہ اہل خیر کی زبان سے بلا ارادہ بھی جھوٹ نکلتا ہے۔

ایوب سختیانی نے اپنے ایک پڑوسی کے علم، زہد، عبادت و طہارت کی بہت تعریف کی مگر اس کے بعد کہا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک کھجور کے بارے میں بھی کوئی شہادت دے تو میں قبول نہیں کروں گا۔ (توجیہ النظر صفحہ ۲۵)

اس لئے مجبوراً رواۃ کی صداقت، ثقاہت اور عدالت کا مدار شہرت اور مقبولیت پر رکھا گیا یعنی ان لوگوں کی روایت لی جائے جن کی ثقاہت اہل علم میں مقبول اور مشہور ہو۔

حدیثیں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حکم سے دوسری صدی ہجری کے آغاز سے کتابوں میں لکھی جانے لگیں۔ گو اس وقت بھی لوگ جانچ کرتے تھے مگر اصل تنقید حدیث کا زمانہ تیسری صدی ہے۔ بیشتر ائمہ جرح و تعدیل اسی عہد میں ہوئے[۱] ان ائمہ میں بھی تسامح موجود تھا۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے

> ابن حنبل، ابن مہدی اور ابن مبارک تینوں کا بیان ہے کہ ہم حلال اور حرام کی روایت کی جانچ میں سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایت میں نرمی۔

ملا علی قاری موضوعات میں لکھتے ہیں۔

> هذا كله بحسب الظاهر للمحدثين من حيث نظرهم الى الاسناد والا فلا مطمع للقطع لتجويز العقل ان يكون الصحيح فى نفس الامر موضوعا والموضوع صحيحا۔
>
> یہ سب کچھ وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتا ہے، ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انھوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

چنانچہ جملہ اصولیین اور ائمہ محدثین نے صحیح سے صحیح حدیث کی صحت کو بھی ظنی مانا ہے، یقینی نہیں کہا ہے بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے[۲]۔ انھوں نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں، مثلاً قوی، حسن، مقبول یا ضعیف، موضوع، منکر اور مردود۔ ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے ورنہ روایت کی تو صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، صحیح یا غلط۔

غرض حدیث کی جو تنقید ہوئی ہے، اس میں ابھی بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے۔ علامہ ابن جوزیؒ نے جو حدیث میں کسی قدر متشدد تھے۔ اپنی کتاب الموضوعات الکبری میں سنن اربعہ کی بہت حدیثوں بلکہ صحیحین یعنی بخاری اور مسلم کی بھی متعدد حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے۔ علماء نے رفع امان کے خیال سے ان کی تردید کی، لیکن دلیل بجز اس کے اور کچھ نہ دی کہ یہ مسلم چلی آتی ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ جو باوجود اس کے کہ حدیث میں بہت نرم ہیں، لکھتے ہیں کہ ابن جوزی نے ابھی اس قدر موضوعات چھوڑ دی ہیں کہ ان کی کتاب کے برابر (یعنی چار جلد کی) ایک دوسری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

---

[۱] مثلاً احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، امام بخاری، مسلم اور ارباب سنن وغیرہ۔

[۲] شیخ طاہر جزائری لکھتے ہیں کہ وہ حدیثیں جن کو تواتر کہا گیا ہے درحقیقت ان میں صرف تواتر معنوی ہے۔

موضوعات کا اثر اگرچہ ائمہ محدثین نے ان مکذوبات سے امت کو بچانے کی کوشش کی، لیکن ان کا تسلط دلوں پر اس قدر ہوگیا تھا کہ آج تک ہزاروں موضوع حدیثیں مسلمانوں کا دینی سرمایہ بنی ہوئی ہیں اور ان کے عقائد و اعمال میں دخیل ہیں۔ یوں تو باب الطہارت سے لے کر باب الحشر و النشر و باب الجنۃ والنار تک ایک بھی ایسا نہیں ہے، جس میں موضوعات نہ ہوں، لیکن بعض ابواب ایسے ہیں کہ ان میں صرف موضوعات ہی ہیں یا انھیں کی کثرت ہے۔ مثلاً

صلاۃ تسبیح	ایک حدیث بھی صحیح نہیں
صلاۃ حاجت	"
صلاۃ الاسبوع	"
صلاۃ الفیہ	"

تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ بعض صوفیانہ کتابوں مثلاً ابوطالب مکی کی قوت القلوب یا ثعلبی وغیرہ کی تفسیروں سے جنھوں نے غلط فہمی سے نصف شعبان کی رات کو شب قدر کہہ دیا، لوگوں نے اس میں صلاۃ الفیہ جاری کی اور دس دس کی ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کیں اور عید سے بھی زیادہ شب برات کا اہتمام کرنے لگے۔ یہانتک کہ اس نے میلہ کی شکل اختیار کرلی، جس میں اس قدر فسق و فجور ہونے لگا کہ اولیاء اللہ بیابانوں میں نکل جاتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں اللہ کا قہر نازل ہوجائے۔ سب سے پہلے اس کا رواج بیت المقدس ۴۴۸ھ میں ہوا پھر سارے شام اور مصر میں پھیل گیا۔ آخر میں علماء مصلحین نے توجہ کی، جن کی کوشش سے یہ بدعت مٹ گئی، تاہم اس کا سلسلہ کچھ نہ کچھ آٹھویں صدی ہجری تک رہا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شب برات میں روشنی کی ابتدا برامکہ سے ہوئی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لائے تھے۔ انھوں نے دین اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم کو تازہ کیا۔ اسی نے رفتہ رفتہ آتش بازی کی شکل اختیار کرلی جو مغرب سے مشرق تک پھیل گئی۔

زیارت قبر نبیؐ	ایک حدیث بھی صحیح نہیں
فضائل ائمہ اربعہ	"
فضائل عرب و زبان عربی	"
مذمت عجم و زبان عجمی	"
فضائلِ ابدال و اوتاد و قطب و غوث	"

صوفیہ کی کل مشہور حدیثیں موضوعات کی فہرست میں داخل ہیں مثلاً

کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔

رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر۔

اعدا عدوک نفسک التی بین جنبیک۔

ذرۃ من اعمال الباطن خیر من الجبال الرواسی من اعمال الظاہر۔

القلب بیت الرب

ان للہ سبعین حجاباً من نور۔ وغیرہ

علماء اور متکلمین کے فضائل میں بھی تمام حدیثیں خود ساختہ ہیں۔ مثلاً

علماء کی سیاہی شہداء کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

ایک فقیہ شیطان کے لئے ہزار عابد سے گراں تر ہے۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ یا میری امت کے علماء بمنزلہ انبیاء بنی اسرائیل کے ہیں۔

جو شخص طلب علم کیلئے نکلتا ہے فرشتے اس پر (اس کے پاؤں کے نیچے) اپنے پر پھیلاتے ہیں۔

عالم کی طرف ایک نگاہ ڈالنا ساٹھ سال کے قیام اور صیام سے بہتر ہے۔

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم

العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان وغیرہ

فضائل صحابہ ۔۔۔۔۔۔ اکثر حدیثیں موضوع ہیں

مناقب اہل بیت ۔۔۔۔۔۔ "

ہدیہ اور تحفہ کی فضیلت ۔۔۔۔۔۔ "

نکاح کی فضیلت اور عورتوں کی مدح ۔۔۔۔۔۔ "

فضائل درود ۔۔۔۔۔۔ "

مدائح نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔۔۔۔ " مثلاً

لولاک لما خلقت الافلاک

کنت نبیاً وآدم بین الماء والطین

انا مدینۃ العلم وعلی بابہا

انا افصح العرب والعجم

امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ مغازی، ملاحم اور تفسیر ہر چند کہ

علما نے اس کی تاویل کی ہے، لیکن فی نفسہ یہ قول کسی تاویل کا محتاج نہیں۔ چند حدیثیں ان ابحاث میں اگر صحیح ثابت ہو گئیں تو مستثنیات میں ہیں۔

افتراق امت کے متعلق جتنی حدیثیں ہیں موضوع ہیں مثلاً یہود و نصاریٰ کے ۷۲ فرقے ہوئے اور میری امت کے ۷۳ ہوں گے، جن میں سے صرف ایک جنتی ہے، اس کی غلطی واقعتاً بھی ظاہر ہے کیونکہ ۷۳ فرقے مسلمانوں کے چوتھے اور پانچویں ہی صدی ہجری میں علما نے شمار کر دیئے تھے۔ اس کے بعد سے آج تک سینکڑوں فرقے بنے اور بنتے جا رہے ہیں۔

موضوع صحابہ اگرچہ ائمہ محدثین اور جملہ اہل تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ روئے زمین میں سب کے آخری صحابی جو رہ گئے تھے وہ حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ ہیں جنھوں نے مکہ میں سنہ ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ مگر ان کذابوں اور وضاعوں نے زمانہ مابعد میں بہت سے طویل العمر صحابہ مخترع کر لیے۔ منجملہ ان کے یہ لوگ ہیں،

جبیر بن حرب: حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ غزوۂ خندق میں شریک تھے۔ امیر عبدالکریم بن نصر کا بیان ہے کہ میں نے امام ناصر کے ساتھ سنہ ۵۹۵ھ میں ان کی زیارت کی تھی۔

ابو عبداللہ محمد ثقلی۔ پانچویں صدی ہجری میں تھے۔ ان کے بارے میں بیان کیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا تھا۔ لوگ جا کر تبرکاً ان سے مصافحہ کرتے تھے۔

قیس بن تمیم: ان کی پیشانی پر ایک نشان تھا، جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت علیؓ کے خچر نے لات ماری تھی۔ چھٹی صدی ہجری کے آغاز یعنی سنہ [illegible]ھ میں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی تھیں۔ گیلان میں رہتے تھے۔

بابا رتن ہندی: متوفی سنہ ۶۳۲ھ ان کی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھے۔ ہندوستان میں رہتے تھے۔

ان زندہ صحابیوں کو کھڑا کر کے ان کی زبان سے طرح طرح کی روایتیں امت میں پھیلائی جاتی تھیں۔ بعض لوگ سندِ عالی کے خیال سے ان ثلاثیات کو کتابوں میں درج کرتے تھے۔ علما کی ذہنیت اس قدر جامد تھی کہ جب ائمہ حدیث ان خرافات کا انکار کرنے لگے تو بعض لوگوں نے ان کے ساتھ مجادلہ کیا۔ امام ذہبی نے بابا رتن کی جملہ روایتیں موضوعات میں شامل کیں۔ اس پر علامہ مجدالدین صاحب قاموس بگڑ بیٹھے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے جب ان خرافات کی تغلیط کی تو علامہ صفدی ان کی تردید کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

باب المراسلات

۱. تعدد ازدواج | جہلم سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

باب المراسلات ماہ اگست ۱۹۴۹ء میں تعددِ ازدواج کے سوال کے جواب میں طلوع اسلام کا شذرہ شائع ہوا ہے، جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مذہب اسلام میں تعددِ ازدواج کی اجازت بطور استثنار ہنگامی صورتِ حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دی گئی ہے، جس کا فیصلہ نظام اسلامی کرے گا اور یہ اجازت مساویانہ سلوک کی شرط سے مشروط ہوگی۔

قرآن خوانی کے دوران میں مجھے بارہا خیال آیا کہ قرآن مجید (سورۂ نساء) میں تعدد ازدواج کا ذکر تو محض یتیموں کی تعداد میں اضافہ کے ضمن میں آیا ہے اور اس لئے ایک خاص صورتِ حالات کے متعلق ہے مگر مسلمانوں میں تعدادِ ازدواج کی عمومیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس خیال کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

مسلمانوں میں تعددِ ازدواج رسولِ کریمؐ سے شروع ہوا اور صحابہ کرامؓ میں بھی اس کا رواج عام تھا رسولِ اکرمؐ قرآن کے سب سے بڑے مفسر تھے اور صحابہ کرام ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے قرآن کا علم رسولِ اکرمؐ سے حاصل کیا تھا۔ اس لئے ان کی قرآن فہمی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو سوالات میرے ذہن میں آتے رہے ہیں وہ جواب کے لئے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ قرآن کریم میں یہ اصول کہ مرد کو صرف ایک بیوی کی اجازت ہے، کہیں مذکور نہیں۔ اسلام سے پہلے عرب میں تعدد ازدواج عام تھا۔ اگر اس کے برخلاف حکم نہیں دیا گیا تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام اس رواج کو توڑنا نہیں چاہتا تھا؟ "ازدواج" معاشرت کا بنیادی مسئلہ ہے، اور یہ حیران کن ہے کہ کتاب مقدس اس بنیادی مسئلہ کے متعلق خاموشی اختیار کرے یا کم از کم کوئی قطعی حکم نہ دے جبکہ معاشرت کے معمولی مسائل پر ناطق احکام موجود ہیں۔

۲۔ رسولِ اکرمؐ کا تعدد ازدواج ایک تاریخی امر ہے۔ کیا حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بعد تمام ازواجِ مطہرات کے نکاح اس وقتی ضرورت کو مدنظر رکھ کر کئے گئے جس کا ذکر سورۂ نساء آیت ۳ میں ہے؟ اگر نہیں تو اسوۂ رسول کی پیروی امتِ مسلمہ کیوں نہ کرے۔

۳۔ کیا تمام صحابہ کرام کے تعددِ ازواج میں یہی شرط مضمر تھی؟ اور کیا یہ بات حتمی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے؟

۴۔ رسول کریمؐ کے نواسے امام حسنؓ کے متعلق ایک دفعہ پڑھا تھا کہ ان کی شادیوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی۔ بلکہ ان کی کنیت ہی بہت طلاق دینے والا مشہور تھی۔ اگر یہ درست ہے تو ان کے طرزِ عمل کی بنیاد کس پر تھی؟

۵۔ اگر واقعی رسولِ اکرمؐ، صحابہ اور رسولؐ کے نزدیک ترین قرابت داروں کا طرزِ عمل تعددِ ازواج کے حق میں ہے تو یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ سورۂ نساء کی آیت صرف یتیم لڑکیوں سے نکاح کے متعلق ہے اور اسلام میں تعددِ ازواج جائز ہے؟ اور ایسے تعدد کی کوئی حد (Limit) بھی مقرر نہیں؟

۶۔ ہنگامی حالات مثلاً جنگ وغیرہ جن میں یتیم لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا، ان میں بیواؤں، باپ والی لڑکیوں اور غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد میں بھی ایزادی ہوگی۔ اس استثناء کو صرف یتیموں تک ہی کیوں محدود رکھا گیا، اور باقی اقسام کے متعلق کیا حکم ہوگا۔ وغیرہ

یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ سوالات نکتہ چینی کے لئے نہیں لکھے گئے۔ بلکہ ایک طالب علم کی حیثیت۔ یہ اور اس قبیل کے سوالات پڑھے لکھے طبقے کے افراد میں، جو قرآن فہمی کی کوشش کرتے ہیں، اکثر اٹھائے جاتے ہیں۔ باب المراسلات کے جواب نگار صاحب سے استدعا ہے کہ وہ محترم غلام احمد پرویز سے عرض کریں کہ اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ کی ضرورت ہے جو جلد ہی شائع ہونا چاہیے۔

طلوعِ اسلام جنابِ مستفسر نے بڑے اہم اور معقول سوالات اٹھائے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے، ان کے مفصل و مشرح جواب کیلئے مبسوط مقالہ کی ضرورت ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام اپنی تنگیٔ داماں کا ہمیشہ گلہ سنج رہا ہے اس لئے سردست مختصر اشارات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ جوابات نمبروار عرض کئے جاتے ہیں۔

۱۔ قرآن میں یہ اصول کہ عام حالات میں ایک ہی بیوی کی اجازت ہے، مذکور ہے۔ خود سورۂ نساء میں جہاں خاص حالات میں تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہے یہ موجود ہے کہ الا تعدلوا فواحدۃ (۴) "اگر تم عدل نہ کر سکو تو پھر ایک ہی عورت رکھو"۔ اس سے ظاہر ہے کہ عام اصول ایک ہی بیوی سے رشتۂ مناکحت کا ہے۔ صرف خاص حالات میں بشرطِ عدل، ایک سے زائد کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ "مثنیٰ و ثلٰث و ربٰع" (دو، تین اور چار) کے الفاظ خود اس پر شاہد ہیں کہ عام اصول ایک ہی کا ہے۔ خاص حالات میں اجازت دو سے شروع ہوتی ہے اور چار تک جا کر رک جاتی ہے۔

اسی سورہ میں چند آیات آگے جا کر طلاق سے متعلقہ احکام میں ہے کہ وان اردتم استبدال

زوجٍ مکان زوجٍ (یعنی) "اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہو" واتیتم احدٰھنّ قنطارًا فلاتاخذوا منہ شیئاً" اور اگر تم اسے سونے کا ڈھیر بھی دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو" یعنی اگر موجودہ بیوی سے نباہ نہ ہو تو اسے طلاق دو اور اس کے بعد دوسری عورت سے شادی کرو۔ اس آیت کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس میں صرف "ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنے" کا ذکر ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی چار بیویاں ہوں اور وہ ان کی جگہ بدل بدل کر نئی نئی عورتوں سے شادی کرنا چاہے تو اس کے متعلق حکم ہے کہ ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری عورت کو لے آؤ۔ لیکن اس آیت کو جب "فواحدۃ" والی آیت کی روشنی میں پڑھا جائے تو اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ عام حالات میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری کی اجازت نہیں۔ پہلی بیوی کے (قرآنی شرائط وحدود کے مطابق) طلاق پالینے کی صورت میں اس کی جگہ دوسری بیوی کی اجازت ہوگی۔

اس کے بعد سوالات علاثاثہ کو لیجئے۔ ان میں جناب مستفسر نے ایک بہت اہم سوال کو پیش کیا ہے۔ یعنی قرآنی احکام اور تاریخ کی باہمی حیثیت۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان جس پریشانی فکر و نظر سے گذر رہا ہے (اور اس کی یہ کیفیت آج سے نہیں، صدیوں سے ایسی ہی چلی آرہی ہے) اور جو مسائل حیات میں تضاد اور ذہنی خلفشار سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ اس کی بنیادی وجہ قرآن اور تاریخ کے صحیح موقف (پوزیشن) کا عدم یقین ہے۔ یعنی اس نے دین اور تاریخ کا صحیح صحیح مقام متعین نہیں کیا جس کی وجہ سے زندگی کی کوئی حقیقت اور دین کا صحیح نظام اس کے سامنے واضح طور پر نہیں آتا جس معاملہ میں دیکھو اختلاف۔ جس مسئلہ میں غور کرو تشتت وافتراق۔ اگر ہم قرآن کو اس کے صحیح مقام پر رکھیں اور تاریخ کو اس کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیں تو ہماری بہت سی مشکلات کا حل آج ہی ہو جائے۔

قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ ایک یقینی صحیفہ ہے جس کا ایک ایک لفظ بعینہٖ وہی ہے جو نبی اکرمؐ کے حسن وساطت سے نوع انسانی کو ملا۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کسی رد وبدل کا امکان نہیں۔ لہٰذا جو چیز قرآن میں ہے اسے بلا توقف وتامل حتمی اور یقینی تصور کرنا ہوگا۔ یہ ایک مسلمان کا ایمان ہے جس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

قرآن کے بعد تاریخ دین ہمارے سامنے آتی ہے۔ تاریخ دین سے مراد یہ ہے کہ عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں قرآنی نظام کس طرح متشکل ہوا۔ تاریخ دین کی کتابوں میں کتب احادیث کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ ان کی صحت کو عقیدہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ (قرآن کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ صحیح کتاب) مانا اور منوایا جاتا ہے۔ لیکن کتب احادیث (یعنی دیگر کتب تاریخ تو ایک طرف، خود کتب احادیث بھی) ضمن تعاملیں نہ

جس انداز سے مرتب ہوئی ہیں وہ اس پر شاہد ہے کہ انھیں کس حد تک حتمی اور یقینی کہا جا سکتا ہے۔ بخاری شریف عہد رسالت مآبؐ سے قریب سوا دو سو سال بعد مرتب ہوئی اور اس کا مدار تمام تر ان روایات پر مشتمل ہے جنھیں امام بخاریؒ نے لوگوں کی زبانی سنا۔ انھوں نے قریب چھ لاکھ روایات جمع کیں اور انھیں اپنے قیاس سے چھانٹا اور قریب چھ ہزار اپنے مجموعہ میں داخل کیں۔ اب اس سے خود اندازہ فرمائیے کہ جہاں تک حتم و یقین کا تعلق ہے قرآن کے مقابلہ میں، تاریخ کی ان "صحیح ترین" کتابوں کی حیثیت بھی کیا رہ جاتی ہے۔

اب اس سے آگے بڑھئے۔ نبی اکرمؐ کی پوری حیاتِ طیبہ، قرآن کے مطابق تھی۔ خود قرآن میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ آپ وحی کی اتباع کریں۔ حضورؐ کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ میں قرآن کی اتباع کرتا ہوں۔ اگر قرآن میں یہ کچھ بصراحت مذکور نہ بھی ہوتا تو بھی اس میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہ تھی کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ، قرآن کی اتباع تھی، اس لئے کہ اگر رسول بھی اپنی وحی کی اتباع نہیں کرے گا تو اور کون اس کی اتباع کرے گا۔ رسولؐ کے ساتھ ہی وہ جماعت سامنے آتی ہے جو رسولؐ کی تربیت یافتہ اور قرآنی نظام کے قیام کی اولیں ذمہ دار تھی۔ ظاہر ہے کہ قدوسیوں کی اس جماعت کی زندگی بھی قرآن ہی کی اتباع تھی۔

اب اگر ہم دیکھیں کہ قرآن میں ایک حکم ہے اور تاریخ (کتب روایات وسیر) میں نبی اکرمؐ یا صحابہؓ کا کوئی عمل یا قول اس کے خلاف مذکور ہے تو ہمیں اسی نتیجہ پر پہنچنا ہوگا کہ تاریخ نے اس واقعہ کو ہم تک صحیح طور پر نہیں پہنچایا۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہ عمل یا قول، قرآنی حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ ہے ہی نہیں جو قرآن کو ماننے والوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو، اس لئے کہ قرآن حتمی ہے اور تاریخ ظنی۔ اور جب بھی ظن اور یقین میں تصادم و تنازع ہوگا تو یقین کو بہر حال و بہر نوع صحیح تسلیم کیا جائے گا۔ ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً۔

لیکن ہماری بدبختی کہ ہم نے ظن کو یقین پر غالب قرار دے رکھا ہے، چنانچہ یہ چیزیں ہمارے عقیدہ میں داخل ہیں کہ حدیث، قرآن پر قاضی ہے، حتیٰ کہ اس کی ناسخ بھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دین یکسر ظنیات کا مجموعہ بن چکا ہے، حتیٰ کہ اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی حیاتِ طیبہ کہ جو اپنی سیرت کی رفعت اور کردار کی پاکیزگی میں انسانی کمال کے افقِ اعلیٰ پر فائز المرام ہے، ایسے واقعات سے ملوث کردی گئی ہے جنہیں دیکھ کر نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ اس کیلئے آپ "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" یعنی بخاری شریف ہی کو اٹھا کر دیکھئے۔ حقیقت سامنے آجائیگی احکام و مسائل کو چھوڑیئے۔ صرف تاریخی واقعات کو لیجئے اور سوچئے کہ کیا یہ تاریخ کسی صورت

میں بھی قابلِ اعتماد قرار پاسکتی ہے؟ مثلاً بخاری شریف (کتاب الوضو) میں ہے،

حضرت انس فرماتے ہیں کہ عکل یا عرینہ کے چند آدمی آئے اور مدینہ میں انھیں پیٹ کی بیماری ہوگئی۔ رسول اللہ نے انھیں اونٹنیوں میں جانے اور ان کا دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ گئے۔ جب تندرست ہوگئے تو حضورؐ کے چرواہے کو قتل کرکے اونٹنیوں کو ہانک کر لے گئے۔ جب صبح کو آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے ان کے پیچھے آدمی دوڑائے۔ سورج چڑھتے ہی وہ لوگ (گرفتار کرکے) لائے گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں اور سیسہ پگھلا کر ان کی آنکھوں میں ڈالا جائے اور مقام حرہ میں انھیں پھینک دیا جائے وہ لوگ شدت پیاس سے پانی مانگتے تھے لیکن انھیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔ [۱]

کیا آپ کا خیال ہے کہ حضورؐ نے انھیں اونٹنیوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا ہوگا اور اس ذاتِ رحمت اللعالمین نے ان مجرمین کو اسی طرح قتل کردیا ہوگا جس طرح اس حدیث میں مذکور ہے؟ یا مثلاً کعب بن اشرف کے واقعہ قتل کو لیجئے جو بخاری کی ایک حدیث میں شرح و بسط سے مذکور ہے۔ مختصراً یہ کہ حضورؐ نے فرمایا کہ کعب بن اشرف نے خدا اور اس کے رسولؐ کو تکلیف دی ہے لہٰذا اس کو کون قتل کرے گا۔ محمد ابن مسلمہ نے کھڑے ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے قتل کردوں۔ فرمایا ہاں! ابن مسلمہ نے عرض کیا کہ پہلے مجھے اس سے ایک بات بنانے کی اجازت دیجئے۔ فرمایا جو تدبیر چاہو کرو۔ چنانچہ اس کے بعد اس "بات بنانے اور تدبیر کرنے" کی پوری تفصیل موجود ہے کہ حضرت مسلمہؓ نے کس طرح کعب بن اشرف کو بہانہ سازی اور فریب دہی سے بلایا اور اس کے سر کی خوشبو سونگھنے کے بہانے سے اسے قتل کردیا۔

ظاہر ہے کہ حضور سرورِ کائناتؐ یا صحابہ کبارؓ تو ایک طرف، دشمن کو اس طرح بہانہ سازی سے قتل کرنا، عام عربوں کی قومی خصوصیات کے بھی منافی تھا۔ اسلام نے آکر انھیں مکارمِ اخلاق کی جن بلندیوں پر کھڑا کردیا تھا اسے سورج کی آنکھ نے دوبارہ نہیں دیکھا۔ لیکن ان کا تو زمانہ جاہلیت میں یہ عالم تھا کہ ان کی دوستی اور دشمنی بالکل للکار کر ہوتی تھی۔ خدع و دنائت ان کے قومی خصائص کے منافی تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ تاریخ کا یہ واقعہ قطعاً قابلِ اعتماد نہیں۔

یا مثلاً بخاری شریف میں ہے کہ

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے محمدؐ کو حق کے ساتھ نازل کیا اور ان پر کتاب نازل کی اس میں سنگساری (زنا کی سزا یعنی رجم) کی آیت موجود تھی۔

---

[۱] ہم نے احتیاطاً ترجمہ بھی خود نہیں کیا۔ مولانا مولوی حکیم ابو محمد صاحب تھانی جالی۔ گجراتی کے مطبوعہ ترجمہ کو نقل کردیا ہے۔

قرآن ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں کہیں سنگساری کی آیت نہیں۔ اب اگر کوئی شخص اس آیت سے یہ دلیل لے آئے کہ جو قرآن اس وقت ہمارے پاس موجود ہے، وہ قرآن نہیں جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تھا، اس قرآن میں اس سے کچھ زیادہ بھی تھا۔ تو یہ دلیل اس لئے غلط ہوگی کہ قرآن اپنی حفاظت کے لئے خود اللہ تعالیٰ کو ذمہ دار بتاتا ہے اور یہ روایت اس حفاظت کی تکذیب کرتی ہے۔ یا مثلاً ازواجِ نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں بخاری میں یہ روایت ہے کہ فتح خیبر کے بعد (حضرت صفیہؓ) کے حسن و جمال کا چرچا حضورؐ تک پہنچا تو حضورؐ نے (قیدیوں میں سے انہیں اپنے لئے انتخاب فرمایا)۔ فرمائیے! اگر ہم اس تاریخی بیان کو صحیح مان لیں تو بات کہاں تک جا پہنچتی ہے؟ یا بخاری کی یہ روایت کہ "حضورؐ اپنی گیارہ (یا نو) ازواجِ مطہرات کا دورہ ایک ہی شب میں فرمایا کرتے تھے"۔ چنانچہ جب لوگوں کو اس روایت پر تعجب ہوا تو اس کے راوی (حضرت انسؓ) نے ان سے کہا کہ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ "نبی اکرمؐ میں تیس آدمیوں کی قوت رجولیت تھی"۔

اس بیان سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ تاریخ کے واقعات ظنی ہوتے ہیں اس لئے انہیں کسی حتمی نتیجہ کا مدار نہیں قرار دینا چاہئے۔ اور جب صورت یہ ہے تو قرآن کی تفسیر، تاریخی واقعات کے تحت بھی نہیں کرنی چاہئے۔ تاریخی واقعات کو ہمیشہ قرآن کے تابع رکھنا چاہئے۔ [1]

اس اصولی تمہید کے بعد اس سوال کو سامنے لائیے کہ کیا رسول اللہؐ یا صحابہ کبارؓ کے تعددِ ازدواج میں یہی شرط (یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کی کثرت و کفالت کی شرط) مضمر تھی اور کیا یہ بات حتمی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے"؟

تاریخ سے کونسی بات "حتمی طور پر ثابت" کی جا سکتی ہے جب تاریخ کا مدار ہی ظنیات پر ہو! لہٰذا ہمارے سامنے سوال کی صورت یوں آئے گی کہ قرآن میں (۱) عام اصول یہی ہے کہ ایک مرد کی بیک وقت ایک بیوی ہو۔ اور (۲) خصوصی حالات میں بشرطِ عدل تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا—نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی ایک سے زیادہ بیویاں یا تو اس حکم سے پہلے موجود ہوں گی اور یا پھر لامحالہ اسی شرط سے مشروط۔ سورۂ نساء کی (تعددِ ازواج کی) آیت زیرِ بحث سے متعلق عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول یا فتح مکہ کے قریب کا ہے یا ۸ھ۔ چونکہ اس حکم سے پہلے تعددِ ازواج کی

---

[1] ہمارے ہاں اس قسم کی سیرت کوئی نہیں لکھی گئی جس میں تاریخ کو قرآن کے تابع رکھا گیا ہو۔ معارف القرآن (جلد چہارم) اس قسم کی پہلی کوشش ہے جس میں حضورؐ کی سیرت طیبہ کو قرآنی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے اور تاریخ کو اس حد تک قابلِ اعتماد سمجھا گیا ہے جہاں تک وہ قرآن کے تابع جاتی ہے۔ معارف القرآن کے مصنف، جناب پرویز ہماری دلی دعاؤں کے مستحق ہیں کہ اللہ انہیں مزید صحت اور توفیق عنایت فرمائے۔

حد بندی کی گئی ہے اور حضورؐ کا آخری نکاح (حضرت صفیہؓ کے ساتھ) فتح خیبر کے وقت ۷ھ میں ہوا تھا۔ اس لئے اس سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس حکم کا زمانہ نزول فتح مکہ (۸ھ) کے قریب کا ہے۔ اگر تاریخ کی روایات اس کے خلاف ہیں تو ان روایات کو قرآن سے تطبیق دینی ہوگی اور اگر ان میں تطبیق کی صورت نہ ہوگی تو انھیں غلط تصور کرنا ہوگا۔ قرآن کے ایسے کھلے حکم کی موجودگی میں تاریخ کی ان روایات سے (کہ رسول اللہؐ یا صحابہ کبار کی متعدد بیویاں تھیں) یہ دلیل لانا کہ تعدد ازواج غیر مشروط جائز ہے، قرآن کو تاریخ کے تابع رکھنا ہے۔ حالانکہ اصولاً تاریخ (ظن) کو قرآن (یقین) کے تابع رہنا چاہیئے۔

ممکن ہے یہاں یہ کہدیا جائے کہ اس صورت میں تاریخ کی کچھ حیثیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ درست ہے۔ ظنی علم کی حیثیت دوسرے ظنی علم کے مقابلہ میں باقی رہ سکتی ہے۔ یقینی علم کے مقابلہ میں اس کی کیا حیثیت رہ سکتی ہے؟ باقی دنیا کو اس لئے تاریخ پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے کہ ان کے پاس یقینی علم کہیں بھی نہیں ہوتا۔ اقوام عالم میں یہ خصوصیت کبریٰ صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کے پاس چودہ سو سال سے ایک ایسا "تاریخی صحیفہ" ہے جس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ سے بھی زیادہ محکم اور پائدار ہے۔ لہٰذا ہمیں اس یقینی ذریعۂ علم کو چھوڑ کر ظنی ذریعہ علم کو دلیل و حجت بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس دن مسلمانوں نے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا اسی دن ان کی قسمت بدل جائے گی، اس لئے کہ اس کے بعد ان کا دین پھر اپنے اصلی اور یقینی خطوط پر متشکل ہوجائے گا اور اپنے فطری نتائج سے انہیں اقوام عالم کی امامت و قیادت کا مستحق بنا دیگا۔

محترم مستفسر نے رسول کریمؐ کے نواسے امام حسنؓ کی شادیوں اور طلاقوں کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ درست ہے کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انھوں نے حضورؐ سے بھی زیادہ بیویاں کیں اور انھیں طلاقیں دیں، اور دوسری طرف حدیث میں یہ بھی ہے کہ طلاق کو حضورؐ نے بہت ناپسندیدہ عمل (ابغض) قرار دیا ہے۔ اب فرمایئے کہ تاریخ کے یہ بیانات اگر یقینی ہیں تو ان بیانات کی روشنی میں رسول اللہؐ کے نواسے حضرت امام حسنؓ کے متعلق آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں!

اور اگر تاریخ کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ سننا ہو تو وہ بھی سن لیجئے۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا وہ بخشا جاچکا ہے (اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لہم۔ بخاری)۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جس پہلے لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا اس کے ایک دستہ کا سپہ سالار یزید (ابن معاویہؓ) تھا۔

فرمائیے! واقعۂ کربلا، بخاری شریف کی بشارت جنت اور قسطنطنیہ پر لشکر کشی سے متعلق تاریخی بیانات میں آپ تطبیق کی کیا صورت پیدا کریں گے؟ اگر آپ اس کی کوئی صورت پیدا بھی کرلیں تو ان لوگوں سے ذرا پوچھئے کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں جو ایک طرف بخاری شریف کو دین تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف یزید پر لعنت بھیجنے کو بھی جزو عقیدہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن مسلمان نے تو کبھی اتنا سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ میں کیا کیا کچھ مانتا ہوں اور کیا کیا کچھ کرتا ہوں۔

سوال ۸ میں بھی ایک اصولی نکتہ سامنے آگیا ہے۔ یعنی قرآن نے اس استثناء کو صرف یتیموں تک ہی کیوں محدود رکھا ہے حالانکہ ہنگامی حالات میں، جن یتیم لڑکیوں میں اضافہ ہوگا ان میں بیواؤں، باپ والی لڑکیوں اور غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد میں بھی ازدیاد ہوگی۔ ان اقسام کے متعلق کیا حکم ہوگا؟

قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصولی بات بیان کردیتا ہے۔ اس کے تمام متعلقات و تضمنات سے بحث نہیں کرتا۔ یہی وہ تقسیم ہے جسے اس نے محکمات و متشابہات سے تعبیر کیا ہے۔ محکمات وہ محور ہیں جن کے گرد متشابہات (ڈھلتے جلتے حالات کے مطابق احکام) گھومتے ہیں۔ مثلاً قرآن نے سارق (چور) کی سزا قطع ید (ہاتھ کاٹنا) بتائی ہے، لیکن سرقہ کی تفاصیل سے بحث نہیں کی۔ حالانکہ تعزیری قانون کی تکمیل کے لئے سرقہ اور اس کے متعلقات کی مختلف جزئیات کی تعیین ضروری ہے۔ ان جزئیات کو قرآن، اسلامی نظام کے اجتہاد پر چھوڑتا ہے تاکہ بدلتے رہنے والے حالات کے تقاضوں سے ملتے جلتے (متشابہ) قوانین خود مرتب کرلئے جائیں، یا مثلاً وہ کہتا ہے کہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء (عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو) تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ حق انتخاب صرف مرد کو دیا گیا ہے، عورت کو نہیں۔ اس حکم میں تخاطب مردوں سے ہے لیکن دوسری طرف عورتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ یعنی جس طرح مردوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کریں اسی طرح عورتوں کو بھی حق حاصل ہے کہ اپنی پسند سے نکاح کریں۔ پھر، ما طاب (پسندیدگی) بھی بلا حدود و قیود نہیں ہوگی (حالانکہ آیۃ زیر نظر میں اس کی شرائط و حدود کہیں بیان نہیں کی گئیں)۔

اولاً، محرمات اس سے یکسر خارج ہوں گی۔ پھر پسندیدگی کیلئے اختلاط فاحشہ کی اجازت نہیں ہوگی، نہ ہی ایسے ارتباط کی جو قرآن کی دوسری حدود سے جا کر ٹکرائے۔ قرآن نے ان تفاصیل کو بیان نہیں کیا لیکن اصول پسندیدگی میں یہ تمام مستثنیات و تعلیقات شامل ہیں۔

یا دوسری طرف، مثلاً ارشاد ہے کہ ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق۔ (اپنی اولاد کو

مفلسی کے خوف سے مت قتل کرو)۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اولاد کو مفلسی کے خوف کی بنا پر قتل نہ کرو، باقی حالات میں بیشک قتل کر دیا کرو۔ قتلِ اولاد تو بہرکیف منع ہے۔ اس خصوصیت (املاق) کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس زمانہ میں قتلِ اولاد کا محرک جذبہ بیشتر، افلاس ہی ہوتا تھا۔ یا مثلاً ارشاد ہے کہ ولا فسوق ولا جدال فی الحج (حج میں فسق اور جدال سے احتراز کیا کرو)۔ تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ عام حالات میں بیشک فسق و فجور اور جنگ وجدل میں الجھے رہا کرو البتہ حج کے اجتماع میں اس سے مجتنب رہنا ضروری ہے۔

ہاں! تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اس کے بیان کرنے میں ان علل و اسباب کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے جو زمانہ نزولِ قرآن میں خصوصی طور پر ابھرے ہوئے تھے۔ اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ وہ حکم صرف اسی اصول تک محدود اور انہی علل و اسباب سے مشروط ہے جو قرآن نے بیان کئے ہیں، وہ حکم ایک مرکزی نقطہ ہوتا ہے جس پر پرکار کا ایک پاؤں رکھ کر دوسرے پاؤں سے تمام تشابہ (ملتے جلتے حالات کیلئے) جزئیات کا دائرہ کھینچا جا سکتا ہے۔ اگر اس نقطے کے گرد دائرہ نہ کھینچا جائے تو زندگی کے بدلنے والے تقاضے دم گھٹ کر مر جاتے ہیں یا اپنی تسکین کے لئے اور راہیں تلاش کر لیتے ہیں (جیسا کہ ہمارے ساتھ ہزار برس سے ہوتا چلا آ رہا ہے)۔ اور اگر یہ دائرہ کھینچتے وقت پرکار کا پاؤں مرکزی نقطے سے اکھڑ جائے تو سارا دائرہ خراب ہو جاتا ہے۔

ان مبادیات کی روشنی میں تعددِ ازدواج سے متعلق قرآنی راہنمائی کو دیکھئے۔ عام حالات میں قرآن سے ایک وقت میں ایک بیوی کا اصول سمجھ میں آتا ہے۔ تعددِ ازدواج کے لئے ایک ہی مقام پر اجازت ہے اور وہ سورۂ نساء کی وہ آیت ہے جو فان خفتم الا تقسطوا فی الیتمی (اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکو گے تو . . . . ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت ہے)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اجازت صرف ہنگامی حالات سے وابستہ ہے۔ عمومی حالات میں اسی فواحدۃ (ایک بیوی) کے اصول پر عمل کیا جائے گا۔

اس ہنگامی اجازت کیلئے قرآن نے یتیموں کے مسئلہ کے حل کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اس لئے کہ اس وقت یہی مسئلہ جاذب توجہ تھا۔ اگر اسی قسم کے ملتے جلتے اور ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں تو نظامِ ملت، اسی اصول کی روشنی میں ان حالات کے متعلق بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن عمومی حالات میں انفرادی طور پر تعددِ ازدواج کی اجازت کہیں سے نہیں ملتی۔

اب رہا یہ کہ صحابہ کبارؓ کے ہاں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں تو تاریخ کے اس بیان کے

متعلق ہم یہی کہیں گے کہ (۱) یا تو یہ قصہ، قرآنی حکم سے پہلے کا تھا۔ اور اگر یہ قرآنی حکم کے بعد کی بات ہے تو لامحالہ یہ اسی شرط (یعنی ہنگامی حالات) سے مشروط ہو گا جو قرآن نے بیان کی ہے۔ اگر تاریخ ان تفاصیل کے متعلق خاموش ہے یا اس کی تصریحات قرآن کے خلاف جاتی ہیں تو ہم اس ظنی شہادت کے مقابلہ میں قرآن کے یقینی حکم کو رد نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اُس یقین کو اس ظن کے تابع رکھ کر، قرآنی حکم کی اس قسم کی تاویل کر سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک قرآن اور تاریخ کا یہی تعلق، صحیح تعلق ہے۔

جناب مستفسر نے فرمایا ہے کہ ہم محترم پرویز صاحب سے استدعا کریں کہ وہ اس موضوع پر بسوط مقالہ سپردِ قلم فرمائیں۔ سو عرض ہے کہ معارف القرآن کی پانچویں جلد احکامِ قرآن پر مشتمل ہو گی جس میں پرویز صاحب ان تمام مباحث پر شرح وبسط سے لکھیں گے۔ یہ حقیقت قارئین طلوعِ اسلام کے علم ہی میں ہے کہ طلوعِ اسلام کے قرآنی مباحث محترم پرویز صاحب ہی کے نورِ بصیرت سے مستنیر ہوتے ہیں اور انہی کا تدبر فی القرآن ہم سب کے لئے چراغِ راہ بنتا ہے۔

۲۔ شرعی سزائیں

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۵۹ء میں آپ نے لکھا ہے کہ قرآن نے جو سزائیں بتائی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ سزائیں ہیں۔ حدودِ شرعی نافذ کرنے والے، احوال و ظروف اور جرم کی نوعیت کے پیش نظر ان سے کم سزا بھی دے سکیں گے۔

کیا یہ آپ ہی کا اجتہاد ہے یا اس سے پہلے کہیں اس کی مثال بھی ملتی ہے؟

۲۔ زانی کی سزا سو کوڑے لکھی ہے۔ کیا کوئی شخص سو کوڑے کھا کر زندہ بچ سکتا ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی کی سزا موت ہے اور موت کا طریقہ کوڑے مارنا ہے۔ اس لئے اس کی سزا اگر سنگسار کردی گئی تھی تو اس میں کیا حرج تھا!

طلوعِ اسلام

جی نہیں! یہ ہمارا ہی اجتہاد نہیں، تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً چوری کی سزا قطع ید ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے جو قرآن نے متعین کی ہے۔ کس قدر چوری اور کن حالات میں چوری کے جرم میں مجرم اس سزا کا مستحق ہو گا اور کن حالات میں اس سے کم سزا کا سزاوار، اس کے متعلق فقہ اور روایات دونوں میں تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ روایات (مسلم اور بخاری) میں ہے کہ چوتھائی دینار کی چوری سے کم کی چوری میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ فقہ میں اس کو نصاب کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک نصاب ایک دینار ہے اور بعض کے

نزدیک ربع (چوتھائی) دینار۔ یہ تو رہا مقدار کا سوال۔ اب لیجئے احوال و ظروف کو۔ فقہ کی رو سے چور کو اس وقت تک قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی جب تک اس نے مال کسی محفوظ جگہ سے نہ چرایا ہو۔ نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ جو جانور پہاڑوں پر چرتے پھرتے ہوں ان کی چوری کی بابت کیا حکم ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایسا جانور چرالے تو وہ جانور اور اس جانور جیسا ایک اور جانور پیش کرے اور اسے کوڑوں کی سزا دی جائے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص بھوکا ہو وہ اگر اپنی ضرورت کے مطابق کسی درخت سے پھل توڑ کر کھالے (بشرطیکہ ساتھ باندھ کر نہ لیجائے) تو اس پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور اگر کچھ ساتھ لے جائے تو اس کا دگنا معاوضہ اور کوڑوں کی سزا ہوگی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے زمانۂ قحط میں روٹی چرا کر کھانے والے کو سارق نہیں ٹھہرایا تھا۔ امام ابن حزم ایسے مواقع کے متعلق تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جب غربا پر ایسا وقت آجائے اور دولتمند اس اضطرار کا احساس نہ کریں تو بھوکے غربا کو اجازت ہے کہ ان لوگوں کو لوٹ کر اپنی خوراک حاصل کرلیں۔ اگر اس کشمکش میں غریب مارا جائے تو اس کے قاتل پر اس کا خون بہا ہوگا اور اگر امیر آدمی مارا جائے تو اس امیر پر خدا کی لعنت ہوگی۔ غریب قاتل پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔

"مالِ محفوظ" کی شرط کے متعلق ایک لطیفہ بھی سنئے۔ جب فقہ کا قانون بنا تو (جن دلوں سے تقویٰ اٹھ چکا تھا انھوں نے) اس قانون سے بچ نکلنے کے حیلے بھی وضع کرنے شروع کردیئے۔ اسے کتاب الحیل کہتے ہیں۔ وہی قانونی موشگافیاں اور لفظی فریب کاریاں جو بالعموم وکلاء کی روٹی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

کتاب الحیل میں ہے کہ ایک شخص اور اس کا بیٹا چوری کرنے گئے۔ انھوں نے نقب لگائی اور مال چرایا۔ اس کے بعد گرفتار ہوگئے اور سرقہ کا جرم ثابت ہوگیا۔ اب وہ حیلہ سنئے جس سے قطع ید کی سزا سے بچنے کی تدبیر نکالی گئی۔ باپ نے کہا کہ میں نے مکان میں صرف نقب لگائی تھی مال نہیں اٹھایا تھا۔ لہٰذا میں سارق نہیں ہوں۔ بیٹے نے کہا کہ مال بیشک میں نے اٹھایا تھا، لیکن ایسے مکان سے اٹھایا تھا جس میں نقب لگی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ مال، مالِ محفوظ نہیں تھا۔ لہٰذا میں بھی سارق نہیں ہوں۔

"قانون" کی رو سے دونوں کا دعویٰ درست تھا اس لئے سرقہ کی حد کسی پر بھی عائد نہیں کی جاسکتی تھی۔

غور کیجئے! ملوکیت کی لعنتیں کس انداز سے رگ و پے میں سرایت کرجاتی ہیں۔ جب

اسلامی نظام کا مقصد "انسان سازی" تھا تو اس وقت کیفیت یہ تھی کہ ایک عورت سے، بستی سے دور، خلوت میں، ایک فاحش جرم صادر ہو گیا۔ وہ خود عدالت میں آگئی اور اصرار کیا کہ اسے شریعت کے مطابق سزا دی جائے تاکہ وہ خدا کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔ اور ایک یہ زمانہ تھا (کہ قانون بھی وہی تھا اور ماننے والوں کے ایمان کے الفاظ بھی وہی۔ لیکن روح بدل چکی تھی اس لئے) جرم ثابت ہو چکنے کے بعد ایسے حیلے وضع کئے جاتے تھے جن سے قانون کی گرفت سے نکلا جا سکے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتے تھے کہ ارباب اقتدار اپنے مفاد و خواہشات کے بروئے کار لانے کے لئے ہر روز قانون بدلتے بدلواتے رہتے ہیں، اس لئے انہیں خیال پیدا ہوتا تھا کہ اگر ہم قانون بدلنے پر قادر نہیں تو قانون سے بچنے کی راہیں کیوں نہ ڈھونڈ نکالیں۔

بہر حال، یہ جملہ معترضہ تھا۔

آپ کا دوسرا سوال کوڑوں کے متعلق ہے۔ کوڑے اس قسم کے نہیں ہوتے تھے کہ سو کوڑوں سے انسان کی موت واقع ہو جائے۔ تاریخ میں ہمیں یہ واقعہ ملتا ہے کہ عہد حضرت عمرؓ میں ایک شخص نے دھوکے سے بیت المال سے کچھ روپیہ وصول کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو سو کوڑے پڑوائے۔ پھر دوسرے دن مزید سو کوڑوں کی سزا دی۔ پھر تیسرے دن سو کوڑے اور لگوائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوڑے ایسی چیز نہ تھے کہ جن سے موت واقع ہو جائے۔

باقی رہا یہ کہ زنا کی سزا سنگساری (رجم) میں کیا ہرج ہے۔ سو ہرج یہ ہے کہ جب خدا نے حکم دیدیا کہ اس کی سزا سو کوڑے ہے تو کس کی مجال ہے کہ اس حکم کو کسی دوسرے حکم سے بدل دے!

رفتارِ عالم

کشمیر اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن نے پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں سے متارکہ سے متعلق جو ناکام مراسلت کی اور اس کے جو حصے اب تک شائع کئے جا چکے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کمیشن کی ناکامی کی وجہ ہندوستان کی غیر مصالحانہ روش اور غیر معقول مطالبے ہیں۔ جب متارکہ سے متعلق تفاصیل طے کرنے کا وقت آیا تو ہندوستان نے مطالبہ کیا کہ آزاد کشمیر کی افواج کو غیر مسلح اور منتشر کر دیا جائے۔ حالانکہ ۱۳ر اگست (۱۹۴۸) کی قرارداد جسے ہندوستان نے تسلیم کر رکھا ہے اور جس کے مطابق یہ مذاکرات ہو رہے تھے اس میں بصراحت موجود ہے کہ ان افواج (نیز ہندوستانی افواج) سے متعلق آخری فیصلہ متارکہ کے بعد ہوگا۔ اس صراحت کے باوصف ہندوستان نے یہ مطالبہ کیا کہ آزاد کشمیر افواج کو پہلے غیر مسلح کرکے منتشر کر دیا جائے اور پھر متارکہ کی جزئیات طے کی جائیں۔ پاکستان نے قدرتی طور پر قرارداد اگست کی خلاف ورزی کو روا نہ رکھا اور اس طرح مذاکرات متارکہ ناکام ہو گئے۔ ہندوستان اس خلاف قرارداد مطالبہ کی اساس ان یادداشتوں کو بتا رہا تھا جو نہرو اور ڈاکٹر لوزانو کی گفتگوؤں کا ملخص تھیں، اور جنہیں ہندوستانی حکومت نے گذشتہ جنوری میں بلا اجازت و مشورہ کمیشن شائع کر دیا تھا۔ ہرچند جیسا کہ فروری کی اشاعت میں تبصرہ کیا گیا تھا، ان یادداشتوں کی قانونی حیثیت کالعدم تھی، کیونکہ اسے فریقین (ہندوستان اور کمیشن) نے مصدقہ قرار نہیں دیا تھا اور نہ یہ جزو معاہدہ تھیں جسے پاکستان کی بھی سند قبول حاصل ہو، تاہم ہندوستان نے انھیں حرز جاں بنائے رکھا اور متارکہ سے متعلق مذاکرات میں ان کا ناجائز استعمال کیا۔

کمیشن نے ان مذاکرات میں چنداں جرأت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ درانحالیکہ ہندوستان کی روش غیر معقول اور بے بنیاد تھی، اسے پہلو بدل بدل کر سمجھانے اور بتدریج اس کی غیر معقولیت کے سامنے جھکتے جانے سے کہیں بہتر تھا کہ اسے غیر مبہم الفاظ میں معاہدہ کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کر دیا جاتا۔ ناکامی کے بعد البتہ کمیشن نے بعد از وقت ہی سہی، دلیری دکھائی اور ۲۰ر ستمبر کو راولپنڈی سے یہ بیان شائع کیا کہ ڈاکٹر لوزانو نے دسمبر ۱۹۴۸ء میں آزاد کشمیر افواج کو غیر مسلح اور منتشر کرنے سے متعلق جو ضمانتیں نہرو کو دی تھیں وہ قرارداد اگست کے حصہ سوئم متعلقہ استصواب کی تشریح تھیں اور حصص اول و دوئم پر ان سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس بیان سے پاکستان کے موقف کی تائید ہوتی ہے اور ہندوستان کی تردید۔

ایک طرف تو یوں استصواب کو ٹالا جا رہا ہے اور دوسری طرف نہرو ڈھٹائی سے کہہ رہا ہے کہ ہم کشمیر میں کشمیریوں کی دعوت پر گئے اور انہیں کی رضامندی سے وہاں موجود ہیں۔ وہ جب ہمیں نہیں چاہیں گے ہم واپس آجائیں گے۔ اس زبانی دعوے کے باوجود نہرو یہ موقع نہیں پیدا ہونے دے رہا کہ کشمیری یہ فیصلہ کریں کہ وہ اپنی قسمت ہندوستان سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں یا پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں۔

کشمیر کے معاملہ میں ہندوستان جو حرکات مذبوحی کر رہا ہے اس کی تازہ مثال "ڈلوائی قضیہ" ہے جسے نہرو نے "سنگین معاملہ" قرار دیا ہے اور جس کی "شکایت" کمیشن سے کر دی گئی ہے۔ اس قضیہ کی تفصیلات یہ ہیں کہ سرینگر میں ایک افغانی باشندہ، آفندی کی کچھ جائداد ہے۔ بیگم آفندی نے حکومت افغانستان کی سفارش اور میجر جنرل تھیمیا کی رضامندی سے اس جائداد کو متروکہ جائداد قرار دیئے جانے سے بچا لیا۔ چونکہ وہ خود کشمیر میں مقیم نہیں تھی اس لئے اس نے جنرل ڈلوائی سے جو کہ سرینگر میں اسی کے مکان میں رہتا تھا درخواست کی کہ وہ اس کے گرم کپڑوں والے ٹرنک لائیڈز بنک کی تحویل سے نکلوا کر اس کے پاس راولپنڈی بھجوا دے۔ ڈلوائی نے ایسا ہی کیا، لیکن ہندوستان نے بات کا بتنگڑ بنا دیا اور ڈلوائی پر الزام لگایا کہ اس نے کمیشن کی پالیسی کے برعکس جانبداری کا ثبوت دیا ہے اور ایک ایسے شخص کے زر و جواہر اور قیمتی اشیا باہر بھجوا دی ہیں جسے ریاست کا دشمن قرار دیا جا چکا تھا۔ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ اگر آفندی یا اس کی بیگم کی حیثیت ریاست کشمیر کے غدار کی ہوتی تو ان کی جائداد یقیناً ضبط ہو چکی ہوتی۔ بہرکیف جب یہ الزام سن کر ۹ اکتوبر کو بیگم آفندی نے بتایا کہ جو بکس میرے نام سرینگر سے آئے ہیں وہ بدستور مختوم ہیں اور ان میں گرم کپڑے ہیں، زر و جواہر اور نقدی نہیں۔ حکومت ہندوستان چاہے تو وہ بکس اپنے پاس منگوا لے اور بچشم خود دیکھ لے۔

اس "قضیہ" کے "منظر عام" پر آتے ہی ہندوستانی اخبارات نے یہ لکھنا شروع کر دیا کہ اگر کشمیر کمیشن کا فوجی مشیر ایسی "جانبدارانہ" حرکت کر سکتا ہے تو کمیشن سے استصواب کے معاملے میں غیر جانبداری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ [illegible] حکومت نے ڈلوائی کی واپسی تک کا مطالبہ ضروری سمجھا۔

کشمیر کمیشن ان دنوں جنیوا میں اپنی رپورٹ مرتب کر رہا ہے جو مہینے بھر میں تیار ہو سکے گی۔ ۲۰ اکتوبر کو ایک اخباری ملاقات میں کارلوس لیگوڈی زمون صدر کمیشن نے بتایا کہ رپورٹ میں حفاظتی کونسل سے بھی سفارش کی جائیگی کہ وہ مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کی مساعی جاری رکھے۔ ایرک کالبن، اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل کے ناروی نمائندہ (کشمیر کمیشن) نے اسی تاریخ کو بتایا کہ کمیشن اپنی مساعی کی صاف روئداد تیار کر کے حفاظتی کونسل میں پیش کرے گا اور اس سے درخواست کریگا کہ وہ بتائے کہ کون سے مزید مصالحتی اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔

استصواب کو ٹالتے جانے کے ساتھ ساتھ ہندوستان ریاست میں اپنے قدم اور مضبوط کرتا جا رہا ہے۔ وہ کشمیر کو باب النزاع ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے اپنا لاینفک جز سمجھتا ہے اور اس مفروضہ پر چلا جا رہا ہے۔ ۱۷ اکتوبر کو مجلس دستور ساز ہند نے آئین کی دفعہ ۳۰۶ء منظور کی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر بدستور

ہندوستان کا حصہ رہے گی اور ہندوستانی مجلس مقننہ کو اختیار ہوگا کہ وہ ایسے معاملات سے متعلق قوانین نافذ کرے جن کا یا تو پہلے سے ہی الحاق میں ذکر ہے یا جن کا بعد میں ریاست کی رضامندی سے اضافہ کر لیا جائے۔ کشمیر کمیشن نے دونوں ممالک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مذاکرات مصالحت کے دوران میں کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے مذاکرات کو صدمہ پہنچے۔ اس کے باوجود ہندوستان کی روش میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور دیگر حرکات کے علاوہ اس نے یہ اہم قدم اٹھایا کہ ریاست کے نام نہاد نمائندے مجلس دستور ساز میں مدعو کر لئے اور اب ریاست میں قوانین نافذ کرنے کا حق بھی حاصل کر لیا اور اس مفروضہ پر کہ ریاست ہندوستان کا حصہ ہے اور حصہ رہے گی۔ ہندوستان کی اس روش اور ذہنیت کے پیش نظر کشمیر کمیشن کی موجودہ ناکامی بالکل قابل فہم ہے۔

"چہ دلاور است دزدے . . . " کے مصداق پاکستان کی مزعومہ "بدعہدی" کا رونا روتے ہوئے پنڈت نہرو نے ۱۸ ستمبر کو فیروز پور میں کہا،

پاکستان کا نعرہ یہ ہے ــ پہلے کشمیر، پھر پٹیالہ اور پھر سیدھے دہلی کو۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔

اسی تاریخ کو لدھیانہ میں نہرو نے کہا کہ ہندوستان یہ اعلان کرنے کیلئے تیار ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مابہ النزاع امور کا تصفیہ باہمی مذاکرات سے ہوگا نہ کہ جنگ سے۔

ان تقریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے بلکہ انھیں اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کرتے ہوئے ہندوستان کے نیم سرکاری اخبار ہندوستان ٹائمز نے ۱۲ ستمبر کی اشاعت میں لکھا:

وقت آگیا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ کشمیر میں استصواب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کشمیر میں ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے جن میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب منعقد کیا جا سکے . . . . اگر استصواب کا خیال ترک کر دیا جائے تو ہندوستان کی کوشش ہوگی کہ جنگ نہ ہو۔ وزیر اعظم کے الفاظ اس سلسلہ میں ہماری حکمت عملی کا صحیح آئینہ ہیں . . . ممکن یا آئندہ استصواب کا چرچا بیکار ہے۔ مبادیات سے متعلق نزاعات کبھی ختم نہیں ہو سکیں گے . . . . . . کشمیر کا جتنا حصہ اس وقت کشمیر کے قبضہ میں ہے، ہمارے خیال میں ہندوستان کو اسی پر قناعت کرنی چاہئے۔

چین میں چیانگ کائی شیک کی شکست کے بعد امریکہ کو دوسرا چیانگ کائی شیک تلاش کرنے میں چنداں دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہندوستان کو ایشیائی قیادت کے خواب دکھا دکھا کر ابھارا گیا۔ اب اس پر حفاظتی کونسل کی رکنیت کی بھی نوازش بے جا کر دی گئی ہے۔ پاکستان نے بارہا اس امر پر زور دیا کہ اسے ہندوستان کی رکنیت پر کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر کشمیر کا مقدمہ کہ ہندوستان جس میں ایک فریق کی حیثیت رکھتا ہے حفاظتی کونسل میں پیش نہ ہوتا۔ اس کے باوجود امریکہ نے اپنے سیاسی مفاد کی خاطر ہندوستانی مہرہ کو اس بساط پر آگے بڑھا دیا۔ یہی چال امریکہ نے یورپ میں کمیونزم کو روکنے کے خیال خام سے یوگوسلاویہ سے متعلق چلی۔ یوگوسلاویہ اور روس کے اختلافات اظہر من الشمس

ہیں۔ روس کے مخالف کو اپنا حلیف بنانے کیلئے اور یورپ میں قدم جمانے کی جگہ حاصل کرنے کیلئے امریکہ نے یوگوسلاویہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی طرح یوگوسلاویہ کو بھی حفاظتی کونسل کا رکن بنا دیا گیا ہے۔ روس نے اس اقدام کی شدید مخالفت کی ہے اور اسے خلاف قانون قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس انتخاب کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان نے ٹرومین کی اس اپیل کو کہ امیر البحر نمٹز کو ثالث مان لیا جائے ٹھکرا دیا اور کشمیر کمیشن کو ناکام بنا دیا۔ اس کے باوجود امریکہ اپنے مفاد کی خاطر ہندوستان کو اپنا منظور نظر بنا رہا ہے۔ اس مفاد پرستی اور نوازش بیجا کا اثر لامحالہ کشمیر پر پڑے گا۔ ان کا اندازہ ان اقدامات سے ہو سکے گا جو اس پس منظر میں کشمیر کمیشن کریگا۔

روپیہ کی شرح تبادلہ

برطانیہ نے سٹرلنگ کی شرح تبادلہ میں ڈالر کے مقابلہ میں ۳۱ فیصدی کی تخفیف کر دی تو عام طور پر اندازہ یہی تھا کہ پاکستان بھی لازماً روپیہ کی شرح تبادلہ کم کر دے گا، کیونکہ سٹرلنگ حلقے کے رکن کی حیثیت سے اس کے لئے اسکے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ ہندوستان اور دیگر مستعمرات نے اپنے سکوں کی قیمت میں تخفیف کر بھی دی۔ پاکستان کیلئے یہ مسئلہ بالکل الگ ہی حیثیت رکھتا تھا، بلکہ خود پاکستان کی پوزیشن الگ ہی تھی۔ برطانیہ کا سٹرلنگ کی قیمت گھٹانا قابل فہم اور قدرتی تھا، کیونکہ ڈالر حلقہ کے ساتھ اس کی تجارت گھاٹے کی تھی۔ اس کی درآمد زیادہ تھی اور برآمد کم جس کی وجہ سے اس کا ذخیرہ ڈالر دن بدن کم ہوتا جا رہا تھا۔ برطانیہ کیلئے یہ صورت حال ہنگامی نہ تھی، نہ وہ وقتی مشکلات کا نتیجہ تھی۔ یہ در اصل گہرے عناصر کی شرمندہ تخلیق تھی جو جنگ عالمگیر کے پروردہ تھے۔ اس طویل اور مسلسل نقصان کو پورا کرنے اور تجارت درآمد و برآمد کی قیمتوں میں زیادہ سے زیادہ توازن پیدا کرنے کیلئے برطانیہ کو ڈالر حلقہ سے کم اشیا خریدنے اور وہاں زیادہ اشیا فروخت کرنے کی ضرورت تھی۔ سٹرلنگ کی قیمت گرا دینے سے یہ مقصد بہت حد تک پورا ہو سکتا تھا، کیونکہ اس طرح ڈالر حلقہ میں برطانیہ کی تجارت برآمد زیادہ ہو سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ ڈالر دستیاب ہو سکتے ہیں۔

پاکستان کی حیثیت برطانیہ سے مختلف ہے۔ پاکستان کی برآمد قیمت کے لحاظ سے زیادہ ہے اور درآمد کم۔ بین الاقوامی تجارت میں پاکستان کی حیثیت قابل رشک ہے۔ اس کے سامنے وہ مسائل نہیں جن سے برطانیہ دوچار ہے۔ اسی طرح پاکستان کی ضروریات بھی برطانیہ سے مختلف ہیں۔ پاکستان کو مشینوں کی زیادہ ضرورت ہے جو مشینیں بیشتر ڈالر حلقہ سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ پاکستان اپنے روپیہ کی قیمت میں تخفیف کر دے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشینوں کی خرید میں اسے ۳۱ فی صدی (سٹرلنگ کی قیمت اسی قدر کم کی گئی ہے) کا نقصان ہوگا، کیونکہ مشینوں کی قیمت ڈالروں میں تو وہی رہے گی لیکن روپوں میں زیادہ ہو جائے گی۔ اسی طرح برآمد میں بھی اسے ۳۱ فیصدی کا نقصان ہوگا، کیونکہ روپوں کے مقابلہ میں اسے ڈالر کم ملیں گے۔ گویا مجموعی طور پر برآمد و درآمد میں پاکستان کو ۶۲ فی صدی کا خسارہ ہے۔ اس کا نتیجہ عوام کیلئے خطرناک ہے۔ اشیائے صرف گراں تر ہو جائیں گی اور ان کی گرانی اور

کیا اسی وجہ سے چور بازاری اور بڑھے گی۔ کون ملک ایسے اقتصادی بحران کیلئے رضامند ہو سکتا ہے؟

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سکے کی شرح تبادلہ کم کرنے کا خاطر خواہ نتیجہ جب نکل سکتا ہے کہ متعلقہ ملک اشیائے برآمد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر سکے اور اس طرح نقصان کی تلافی کر سکے۔ برطانیہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن پاکستان نہیں کر سکتا۔ پاکستان کی اشیائے برآمد خام ہیں جن کی مقدار میں فوری اضافہ نہیں کیا جا سکتا یعنی ان کی مقدار محدود اور مقرر ہے جو بڑھائی نہیں جا سکتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر اشیائے برآمد کی مقدار غیر متبدل ہو تو اس تجارت میں نقصان رہے گا کیونکہ تجارت حجم میں اتنی ہی رہیگی لیکن قیمت میں کم ہو جائیگی۔

ظاہر ہے کہ پاکستان نہ تو مشینوں کی قربانی کر سکتا ہے اور نہ یہی گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ہاں کی قیمتیں جو بمشکل قابو میں آسکی ہیں پھر سے بے قابو ہو کر ناقابل برداشت حد تک چڑھنا شروع ہو جائیں۔ قیمتوں کے معاملہ میں مشرقی پاکستان کی حالت ابھی تک تسلی بخش نہیں، ہر وہ اقتصادی یا مالی اقدام جو قیمتوں میں اضافہ کرنے پر منتج ہو مشرقی بنگال کی حالت کو اور مخدوش بنا دے گا۔ ان گوناگوں پہلوؤں پر مکمل غور و خوض کرکے بالآخر ۲۰ ستمبر کو پاکستانی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ پاکستانی روپیہ کی قیمت کم نہیں کی جائیگی۔ قیمت کم نہ کرنے سے پاکستانی روپیہ کی قیمت سٹرلنگ اور ہندوستانی روپیہ کے مقابلہ میں خود بخود بڑھ گئی کیونکہ ہر دو کی قیمت گر چکی تھی اور انگلستان اور ہندوستان کی حکومتوں نے اس تخفیف کا فیصلہ اور اعلان کر دیا تھا۔ اب ایک پاکستانی روپے کی قیمت ۱۸ پنس سے بڑھ کر ۲۵۔۹ پنس ہو گئی ہے۔ اسی طرح ایک سو پاکستانی روپے، ایک سو چالیس ہندوستانی روپوں کے برابر ہو گئے ہیں۔

ہندوستان کا فیصلہ تخفیف اور پاکستان کا فیصلہ عدم تخفیف دونوں ممالک کے جداگانہ اور مخصوص اقتصادی حالات کا نتیجہ تھے۔ ان میں اقتصادی حقائق کو بھی ہندوستان جذبات اور سیاست سے ملوث کئے بغیر نہ رہ سکا اور وہ یہ گوارا نہ کر سکا کہ ہندوستان کے روپیہ کی قیمت تو گر جائے اور پاکستانی روپیہ کی قیمت اور سا لمہ بلند ہو جائے۔ اس نے جن مشکلات و مصائب کو پاکستان کیلئے مقدر سمجھ رکھا تھا وہ بالآخر اسی کے حصہ میں آئیں۔ اضطراری طور پر ہندوستان نے اس نئی شرح تبادلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، گویا آزاد پاکستان کے آزاد سکے قیمتوں کے تعین کے معاملہ میں اقتصادی عوامل کے نہیں بلکہ ہندوستانی خواہشات کے زیر اثر ہیں۔ چنانچہ جب سے سکوں کی نئی شرحیں مقرر ہوئی ہیں ہندوستان اور پاکستان کے مابین تجارت بند پڑی ہے ہندوستان نے پاکستان کو کوئلہ بھیجنا بھی بند کر دیا ہے۔

ہندوستان کا یہ اقدام بالآخر ہندوستان کے مفاد کے منافی ثابت ہوگا اور پاکستان کے حق میں آیۂ رحمت اس وقت پاکستان کوئلہ کی ضروریات کا دو تہائی ہندوستان سے درآمد کر رہا ہے۔ یہ اہم ذریعہ رسد بند ہو جانے سے پاکستان لازماً متبادل ذرائع رسد کو آزمائیگا۔ چنانچہ یہ تلاش شروع ہو چکی ہے اور توقع کی جاتی ہے دوسرے

کوئلہ پیدا کرنے والے ممالک بطیب خاطر پاکستان کو کوئلہ مہیا کریں گے۔ اندریں پاکستان کوئلہ کی متبادلی صورتیں حاصل کرنے میں لازماً عجلت سے کام لیا جائیگا۔ مثلاً اس وقت متعدد مقامات پر برقابی مستقر قائم کئے جا رہے ہیں جن میں پاکستان کو کوئلہ کی قوت متحرکہ سے بے نیاز کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کے علاوہ پاکستانی ریلوں کو کوئلے سے تیل کی طرف منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے اس اقدام شر کا نتیجہ خیر ہوگا اور ہم اس کا استقبال کرتے ہیں۔

(ہندوستان نے کس طرح عملاً پاکستانی فیصلہ عدم تخفیف کو تسلیم کر لیا ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوتا ہے کہ لاہور میں ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کے عملہ کو جو تنخواہیں تقسیم کی گئی ہیں وہ معین تنخواہوں سے چالیس فی صدی کم ہیں۔)

ہندوستان پاکستان کے فیصلہ عدم تخفیف کو اس بین المستعمراتی معاہدہ کی خلاف ورزی پر محمول کر رہا ہے جو جولائی میں رقوم کی ادائیگی سے متعلق ہوا تھا، حالانکہ اس معاہدہ میں شرح تبادلہ کے کم و بیش ہونے کی گنجائش موجود ہے۔ درحقیقت ہندوستان کا اپنا فیصلہ تخفیف مذکورہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہے کیونکہ شرح تبادلہ میں تبدیلی تو خود ہندوستان نے کی ہے نہ کہ پاکستان نے۔ پاکستان نے تو پہلی شرح بحال رکھی ہے۔ اور معاہدہ کی رو سے پاکستان مجبور نہیں کہ وہ شرح تبادلہ میں خواہی نخواہی تبدیلی کرے۔ پاکستانی روپیہ کی نئی قیمت کا اثر صرف ہندوستان پر ہی نہیں بلکہ ہر اس ملک پر پڑتا ہے جس نے اپنے سکوں کی قیمت میں تخفیف کر دی ہے اور جس کے پاکستان سے تجارتی روابط ہیں۔ اندریں حالات تنہا ہندوستان کا پیچ و تاب بے معنی ہے۔

پاکستانی اور ہندوستانی روپوں کی شرح تبادلہ کے فرق نے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ دونوں سکوں میں تمیز قائم کرنے کیلئے پاکستانی روپے کا نام بدل دیا جائے۔ چنانچہ یہ سوال ان دنوں حکومت پاکستان کے زیر غور ہے۔

ہندوستانی حکومت نے شرح تبادلہ کی تبدیلی کے معاملہ میں از حد غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور ان کے نمائندے حتیٰ کہ وزراء تکرار اور بے تکلفی سے کہے جا رہے ہیں کہ پاکستان کو روپیہ کی قیمت کم کرنا پڑے گی۔ ان کی یہ رائے اقتصادی اور مالی عناصر کے بے لاگ اور ژرف مطالعہ کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی مجروح خودی احساس کرب سے کراہ رہی ہے۔ پاکستان کو اس کے جواب میں بار بار یہ کہنا پڑا ہے کہ یہ فیصلہ قطعی ہے اور غیر متبدل۔

ہندوستان کے پاکستانی روپیہ کی شرح تبادلہ کو تسلیم نہ کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذمے پاکستان کی گراں قدر رقوم واجب الادا ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پاکستان کی رقم جو ریزرو بنک آف انڈیا میں جمع ہے	
اس کی مالیت نئی شرح کے مطابق:	۱۴۴ کروڑ روپیہ
تجارتی لین دین کا بقیہ ہندوستان کے ذمہ:	۲۵ " "

سٹیٹ بنک آف پاکستان کے قبضہ میں ہندوستانی نوٹوں

کی مالیت جو ہندوستان واپس نہ لے گا: ۵۰ کروڑ روپیہ

ان ہنڈیوں کی قیمت جو حیدر آباد نے پاکستان کے نام منتقل

کی تھیں اور جسے ہندوستان نے یک طرفہ منسوخ کر دیا تھا: ۲۱ " "

میزان: ۲۲۹ کروڑ روپیہ

پاکستانی روپیہ کی شرح تبادلہ تسلیم نہ کرنے کا ہندوستان کو یہ فائدہ ہوگا کہ اسے یہ رقوم فوری طور پر نہیں ادا کرنی ہوں گی اور جیسے اس نے کچھ وقت کیلئے پاکستان کا ۵۵ کروڑ روپیہ روک لیا تھا اسی طرح چند سے ان رقوم کو غصب کئے رہے گا۔

پاکستانی جوٹ

ہندوستان جس کے جوٹ کے کارخانے پاکستان کی خام جوٹ کے سہارے چلتے ہیں قیام پاکستان سے اس مردود کوشش میں مصروف ہے کہ حیلوں بہانوں سے پاکستانی جوٹ کی قیمت گرائے اور اسے سستے سے سستے داموں میں خریدے۔ نئی صورت حالات کا جواب دار و بادی النظر میں غیر منظم اور غریب جوٹ کے کاشتکاروں کے حق میں مضر ہے۔ ہندوستانی کارخانہ دار ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ ان دنوں ان کی طرف سے کاشتکاروں میں پروپیگنڈا ہو رہا ہے کہ پاکستانی جوٹ کی قیمت بڑھ جانے سے اس کے گاہک کم ہو جائیں گے اور اگر ہندوستان نے جو اس جنس کا سب سے بڑا گاہک ہے، جوٹ کی خرید بند کر دی اور دیگر ممالک نے اس کے بدل تلاش کر لئے تو پاکستانی کاشتکار فاقوں مر جائیں گے۔ غریب کاشتکاروں کو اس طرح ہراساں کر کے ہندوستانی تاجر بے بھاؤ کی جوٹ خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حکومت پاکستان نے اس خطرے کا بروقت احساس کر لیا ہے اور وہ جوٹ کی خرید و فروخت پر خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ جوٹ کی برآمد کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی برآمد کلکتہ کے ذریعہ ہوتی ہے کیونکہ چٹاگانگ کی بندرگاہ اس تجارت کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ایک طرف تو اس بندرگاہ میں توسیع کی جا رہی ہے تاکہ کلکتہ سے بے نیازی ہو جائے، دوسری طرف وزیر اعظم پاکستان نے مشرقی پاکستان کے دورہ میں ۱۳ اکتوبر کو چٹاگانگ میں کہا کہ حکومت کاشتکاروں کو نقصان نہیں پہنچنے دیگی۔ اگر ایسی بات آپڑی تو ساری کی ساری جوٹ حکومت خرید لے گی۔ اس ضمن میں حکومت پاکستان نے ایک نیم سرکاری بنک نیشنل بنک آف پاکستان شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابتداً اس بنک کو مالی سال کے آغاز یعنی اپریل ۱۹۵۰ء سے شروع ہونا تھا لیکن حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بنک کو حلد از جلد شروع کر دیا جائے۔ یہ بنک شروع میں صرف جوٹ اور روئی کی خرید کا کام کرے گا۔ ہندوستان کے اس فتنہ کا افادی پہلو ہے کہ حکومت پاکستان اتنا مفید اور اہم قدم اٹھانے پر تیار ہو گئی۔

مشرقِ وسطیٰ کی غذائی رسدگاہ

پاکستان جس میں مشرقِ وسطیٰ کا غذائی ذخیرہ اور رسدگاہ بننے کی صلاحیت موجود ہے، اس منزل کی جانب گامزن ہوتا نظر آتا ہے۔ ستمبر میں وزارت غذائیہ کو سعودی عرب سے حاجیوں کیلئے ایک ہزار ٹن گیہوں کی ضروری فرمائش موصول ہوئی جسے فوراً پورا کردیا گیا۔ اس اثناء میں دو اہم مسلم ممالک یعنی ترکی اور مصر نے بھی اناج کی رسد کے لئے فرمائش کی ہے اور اس پر مناسب غور ہو رہا ہے۔ توقع ہے کہ ان ممالک کو عنقریب اناج روانہ کردیا جائیگا۔ مسلم ممالک کو مطلوبہ اناج مہیا کرنے کے لئے پاکستان نے چالیس ہزار ٹن کا ذخیرہ جمع کرلیا ہے اور ترکی اور مصر کی ضروریات کو اسی سے پورا کیا جائیگا۔ اس سے پہلے پاکستان پانچ ہزار ٹن گیہوں ایران کو مہیا کرچکا ہے۔ اب تک غیر معمولی حالات کی وجہ سے پاکستان غلہ کی درآمد کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب یہ صورت حال ختم ہو گئی ہے اور "کمی والے" صوبے بھی فالتو اناج کے مالک ہو گئے ہیں۔

پناہ گزینوں کا تازہ ریلہ

متروکہ جائداد کا آرڈیننس نافذ کرنے سے ہندوستان کا مقصد پاکستان کے لئے ایک اور فتنہ پیدا کرنا تھا۔ اس آرڈیننس کا استعمال جس طرح بے محابا ہو رہا ہے اور جس پر پہلے تبصرہ کیا جاچکا ہے، اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ یو۔پی، دہلی وغیرہ کے جن مسلمانوں کی جائدادیں مختلف حیلوں اور بہانوں سے مختوم کرلی گئی ہیں اور انہیں گھروں سے نکال دیا گیا ہے وہ بے خانماں ہو کر کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر متعینہ جالندھر نے ۱۰ اکتوبر کو یہ انکشاف کیا کہ جالندھر کے کیمپ میں مہاجرین کثیر تعداد میں آنا شروع ہو گئے ہیں۔ آپ نے مزید بتایا کہ جب مہاجرین سہارنپور ریلوے اسٹیشن پر پہنچتے ہیں تو انہیں تھانے لے جاکر جملہ اشیاء از قسم نقدی، زیورات، ملبوسات وغیرہ سے محروم کردیا جاتا ہے۔ عورتوں کا مطلقاً پاس نہیں کیا جاتا اور برقعے تک اتار دیئے جاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے وقت ہندوستان نے مہاجرین کا جو بے پناہ سیلاب سوئے پاکستان روانہ کیا تھا، پاکستان اس سے بچ نکلا ہے۔ نہ محض بچ نکلا ہے بلکہ اس نے اپنی اقتصادی حالت مستحکم کرلی ہے۔ ہندوستان اس کے برعکس اقتصادی طور پر تباہ حال ہوتا جارہا ہے اور وہ ابھی تک پناہ گزینوں کے مسئلہ کا حل نہیں کرسکا۔ اندرونی مشکلات اور پریشانیوں سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے وہ مسلمانوں کو تختۂ مشق بنا رہا ہے اور آئے دن مسلمانوں کیلئے نئی مشکلات پیدا کرتا جارہا ہے۔ اب تک اس نے جو کانٹے پاکستان کی راہ میں بوئے ہیں ان سے اسی کے پاؤں زخمی ہوئے ہیں اور جو کنوئیں اس نے پاکستان کے لئے کھودے ہیں اس میں وہ خود ہی گرا ہے۔ اب بھی نتیجہ اس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

پاکستان نے اس کے متعلق احتجاجی یادداشت روانہ کردی ہے اور معاملہ کی سنگینی کو واضح کردیا ہے۔

پاکستان پبلک سیفٹی آرڈیننس

حکومت نے ۸ر اکتوبر کو ایک نئے سیفٹی آرڈیننس کا نفاذ کیا جو سارے پاکستان بشمول ملحق ریاستوں کے محیط ہوگا۔ اور ایک سال تک نافذ العمل رہے گا۔ اس مدت کو بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ یہ آرڈیننس پہلے سے نافذ العمل آرڈیننس ضابطہ یا قانون کی تنسیخ نہیں کرے گا بلکہ ان پر مستزاد ہوگا۔ اس کی رو سے مرکزی حکومت کسی شخص کو امن و تحفظ عامہ کے منافی اقدام کرنے سے روکنے کیلئے بدر کر سکتی ہے، حراست میں لے سکتی ہے یا اس کی حرکات و سکنات پر مناسب پابندیاں عائد کر سکتی ہے۔ اسی طرح حکومت اگر کسی جماعت سے متعلق مطمئن ہو کہ اس کی سرگرمیاں امن و تحفظ عامہ کے خلاف ہوں گی تو وہ اس جماعت کو توڑ سکتی ہے۔ مزید برآں حکومت بعض خبروں کی اشاعت فلموں کی نمائش اور جلسوں کے انعقاد کی بھی ممانعت کر سکتی ہے۔ حکومت کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ خبروں پر سنسر لگا دے یا کسی اخبار، جریدہ، پمفلٹ یا مطبوعہ کو عارضی طور پر یا مستقلاً بند کر دے۔

آرڈیننس کی دفعات ہمہ گیر ہیں اور بظاہر اس سے شہری آزادی پر گہری زد پڑتی ہے۔ عام حالات میں اس پر اصولی اعتراضات ہو سکتے ہیں لیکن ہنگامی موقعوں پر ایسے ہنگامی قوانین کی ضرورت پڑ جاتی ہے جو شہری آزادی کے نقیض ہوتے ہیں۔ لیکن عملاً شہری آزادی کو محفوظ و برقرار رکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ اہل پاکستان اپنی ذمہ داریوں اور موقعہ کی نزاکتوں کا پورا پورا احساس کریں اور متعلقہ حکام اس بظاہر مستبدانہ آرڈیننس کو بے محابا استعمال نہ کریں بلکہ بالکل جائز اور صحیح مواقع پر اس قانون کو حرکت میں لائیں۔ بعض حلقوں میں اس اعلان سے اضطراب پیدا ہو گیا ہے اور احتجاجی آوازیں بھی بلند ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ مگر اس کا صحیح اندازہ اس آرڈیننس کے عملی استعمال ہی سے ہو سکے گا۔

بلوچستان

۱۰ر اکتوبر کو کوئٹہ میں شاہی جرگہ کو خطاب کرتے ہوئے خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان نے یقین دلایا کہ بلوچستان کے انتخابات جلد از جلد ہوں گے اور آزادانہ و غیر جانبدارانہ ہوں گے۔ ۱۰ر اکتوبر کو بلوچستان مسلم لیگ کونسل کو خطاب کرتے ہوئے گورنر جنرل نے یقین دلایا کہ سرکاری حکام کو سخت احکام دیئے جائیں گے کہ وہ آئندہ انتخابات میں جانبداری سے کام نہ لیں۔

۱۴ر اکتوبر کو بلوچستان مشاورتی کونسل کے سامنے ۵۰-۱۹۴۹ کا بجٹ پیش ہوا جس میں دو کروڑ بیس لاکھ روپے کا خسارہ دکھایا گیا ہے۔ چھیالیس لاکھ کی کل آمدنی کے مقابلہ میں دو کروڑ چھیاسٹھ لاکھ کا خرچ ہے۔ بجٹ پر عمومی بحث بعد میں ہوگی۔

سندھ

کہا جاتا ہے کہ سندھ کابینہ نے ۱۲ر ستمبر کے اجلاس میں جاگیرداری کی تنسیخ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب اس کے متعلق مسودہ قانون تیار ہو رہا ہے جسے اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں پیش کیا جائیگا۔ اندازہ ہے کہ کوئی ۱۱ لاکھ ایکڑ زمین ۳۳ فیصدی جاگیرداروں کے قبضہ میں چلی آ رہی ہے۔ تنسیخ جاگیرداری سے

حکومت کو ۸۰ لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کی توقع ہے۔ جو جاگیردار زمین کا مالیہ سے وصول کرتے ہیں انھیں اس کا معاوضہ دیکر اس حق سے محروم کر دیا جائیگا۔

زمینداری کی تنسیخ کو فی الحال خارج از بحث قرار دیا جا رہا ہے۔

سرحد صوبہ سرحد کی مسلم لیگ میں "زندگی" کے آثار ہویدا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ۱۳ر اکتوبر کو صوبائی کونسل کے ۶۵ ارکان نے کونسل کا خصوصی اجلاس منعقد کرنے کا بدیں مقصد مطالبہ کیا کہ بادشاہ گل، صدر صوبہ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کو معرض بحث میں لائیں۔ ان ارکان کے خیال میں مسلم لیگ کے تنظیمی کام کو موجودہ صدر کے دم سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ یہ خصوصی اجلاس ۲۲ر اکتوبر کو پشاور میں منعقد ہوگا۔ یہ تعین جائنٹ سکرٹری کی طرف سے ہوا۔ صدر صاحب نے جو وزیر اعظم کی معیت میں دورہ پر ہیں، ایک بیان میں اس تحریک کو خلاف قاعدہ قرار دیا ہے اور صوبائی کونسل اور ضلعی صدروں کو انتباہ کیا ہے کہ وہ اس تحریک کو شائستہ التفات نہ سمجھیں۔ اس نزاع کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ غازی گل محمد جو صوبائی لیگ کا جائنٹ سکرٹری اور مردان ضلع لیگ کا جنرل سکرٹری ہے، اس کے خلاف ضلع کونسل میں حال ہی میں قرار داد عدم اعتماد پیش ہوئی تھی جسے اس نے بادشاہ گل کی کارستانی پر محمول کیا تھا۔ اس تنازع کا مرکز ثقل اب صوبائی لیگ کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

یہ تنازع اب مسلم لیگ کی مجلس نگران تنظیم برائے مغربی پاکستان کے روبرو پیش ہوگا۔ اس مجلس کا اجلاس ۲۹ر اکتوبر کو پشاور میں منعقد ہوگا۔ بادشاہ گل، صدر نے اعلان کیا ہے کہ صوبائی کونسل کا اجلاس ۲۵ر نومبر کو منعقد ہوگا جس میں "نام نہاد" تحریک عدم اعتماد پیش کی جا سکتی ہے۔

استبدادی ریاستیں سرحدی ریاستوں میں جو دور استبداد کا جو دور دورہ ہے اور جس کے متعلق آئے دن وحشت ناک خبریں آتی رہتی ہیں، اس کا بالآخر پاکستان مسلم لیگ نے بھی اعتراف کیا۔ محمد یوسف خٹک سکرٹری نے ۲۳ر ستمبر کو ایک بیان میں تسلیم کیا کہ سیاسی کارکنوں پر عرصۂ عافیت تنگ کیا جا رہا ہے اور سیاسی قیدیوں اور ان کے لواحقین سے غیر انسانی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ ان ریاستوں کے اندرونی کوائف کا جائزہ لیتے ہوئے سکرٹری مسلم لیگ نے کہا کہ ریاستوں میں مشکل سے ہی کوئی سکول یا ہسپتال مل سکے گا۔ ریاست کی آمدنی کو والیان ریاست جیب خرچ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے حکام اول کو انتباہ کیا کہ بد قسمت باشندے بہت پامال کئے جا چکے ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ نواب دیوار کی تحریر کا مفہوم سمجھیں۔

چترال کی ریاستی مسلم لیگ نے ذمہ دار حکومت کا جو مطالبہ ۲ر ستمبر کو نواب نے پیش کیا تھا وہ منظور کر لیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ اصلاحات سے متعلق اعلان عنقریب شائع ہو جائے گا۔

مغربی پنجاب صوبائی مسلم لیگ کونسل کے ۸۰ ارکان نے کونسل کا اجلاس بدیں وجہ طلب کرنے کی جو

تحریک کی تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں پاکستانی گورنر کیلئے مشیروں کی ضرورت نہیں رہی، وہ مقبول ہوئی۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر کو لاہور میں کونسل کا اجلاس منعقد ہوا۔ کونسل دو حریف گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک مشیروں کو ضروری تصور کرتا تھا اور دوسرا غیر ضروری۔ معقولیت اور معاملہ فہمی نہ ادھر تھی نہ اُدھر۔ مسئلہ دونوں کے سامنے شخصی وقار اور ذاتی شکست و فتح کا تھا۔ دونوں گروہوں نے اپنے اپنے "نقطہ ہائے نظر" کے حق میں فضا سازگار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چودہ دن اسی بھاگ دوڑ میں گزرے۔ مشیروں کے تقرر کا پلڑا آخر میں قدرے جھک گیا اور کونسل کے ۲۸۴ حاضر ارکان نے ۳۲ کی اکثریت سے اس کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ قلیل اکثریت بھی آزادانہ رائے شماری کا نتیجہ نہیں تھی۔ افتتاحی تقریر میں صدر باری نے فرمایا:

> کونسل نے (مشیروں کے تقرر کا) فیصلہ طویل غور و خوض کے بعد کیا تھا۔ اب اس فیصلہ سے پھر جانا مضحکہ انگیز ہوگا۔ . . . . . میں نے اب تو مشیروں کی فہرست بھی گورنر کو دے دی ہے۔ اب اس فیصلہ سے پھرنا کیریکٹر کی کمی پر دال ہوگا اور مومن کے اعلیٰ اصولوں کے منافی!

کونسل نے ۲۶ جولائی کو فیصلہ کیا تھا کہ گورنر کے لئے مشیروں کا تقرر ہونا چاہئے۔ اس وقت سر فرانسس موڈی غیر پاکستانی گورنر تھا۔ اب گورنر پاکستانی اور مسلم لیگی ہے۔ بعض ارکان کونسل کا خیال ہے کہ اب مشیروں کی ضرورت نہیں رہی، لہذا سابقہ فیصلہ بدل دیا جائے۔ ایسا عموماً ہوتا ہے کہ سیاسی پارٹیاں حالات بدل جانے پر اپنا فیصلہ بدل دیتی ہیں۔ یہ بالکل معقول اور قابل فہم روش ہے۔ لیکن صاحب صدر کے "کیریکٹر" اور "مومنانہ شان" نے اپنے فیصلے کو خدائی فیصلہ کی طرح غیر متبدل بنا دیا۔

آگے چل کر صدر صاحب دلیل دیتے ہیں:

> ۲۶ جولائی کی قرارداد کی تنسیخ کا مطلب صدر پر عدم اعتماد ہے۔ چونکہ معاملہ صدارت کے وقار کا ہے لہذا میں ارکان کونسل سے درخواست کرونگا کہ وہ اپنے سابقہ فیصلہ کی تائید کریں۔

گویا مشیروں کا تقرر اس لئے ضروری ہے کہ صاحب صدر اس کے حق میں ہیں اور کسی وقت انھوں نے ترغیب و تخویف سے اس مضمون کی قرارداد منظور کرالی تھی۔

اس اجلاس میں مخالفین تقرر کی طرف سے ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی کہ مشیروں کے تقرر کا معاملہ کلیتہً گورنر کے سپرد کر دیا جائے یعنی وہی فیصلہ کرے کہ مشیروں کی ضرورت ہے یا نہیں، اور اگر ضرورت ہے تو اپنی مرضی سے جن کو چاہے مشیر مقرر کر دے۔ اس دلیل کو ایک رکن کونسل نے یوں رد فرمایا:

> میں پوچھتا ہوں کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ گورنر کٹر لیگی ہونے کے باوصف مشیروں کا تقرر کرلے گا، اور کرلے گا تو وہ واقعی صحیح قسم کے آدمی مقرر کرے گا۔

اس دلیل سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ارکان کونسل کیوں مشیروں کے تقرر پر بضد ہیں اور وہ کیوں ان کا

حق انتخاب صدر کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ ۲۰ اکتوبر کو مولوی عبدالباری نے مشیروں کیلئے جو ۲۱ ناموں کی فہرست گورنر کے پیش کر رکھی ہے اس کے علاوہ چھ سات ناموں کی ایک ترجیحی فہرست گورنر کے سپرد کی تاکہ گورنر کو انتخاب میں سہولت ہو۔ گویا اب تک مشیروں کے تقرر میں تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ گورنر کے لئے باری کے مجوزہ ۲۱ ناموں میں سے پانچ کا انتخاب دشوار ثابت ہوا۔

انتخابات نو انتخابات سے متعلق جو تحقیقاتی کمیٹی شیخ فیض محمد کی صدارت میں مقرر کی گئی تھی اس نے ۱۵ اکتوبر کو اپنی رپورٹ گورنر مغربی پنجاب کے پیش کر دی ہے۔ اس کے بعد یہ رپورٹ جمہور سے استصواب کیلئے شائع کی جائیگی اور پھر مجلس دستور ساز میں پیش کی جائے گی تاکہ آئین میں مناسب ترمیمات منظور کر دی جائیں۔ اندازہ ہے کہ صوبائی اسمبلی کے لئے ۱۹۰ نشستوں کی سفارش کی گئی ہے اور ایک لاکھ آبادی کے لئے ایک نمائندہ ہوگا۔ مہاجرین کے "مفاد" کا بھی اس میں لحاظ رکھا گیا ہے اور خیال ہے کہ پینتیس یا چالیس نشستیں ان کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں۔ ان مخصوص نشستوں کے لئے "مخلوط" انتخاب ہوگا اور مہاجرین اور انصار دونوں کو ان نشستوں کے لئے رائے دینے کا حق ہوگا۔ مہاجر اور مقامی کی تفریق کو جو کئی مقامات پر خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے، یوں آئینی سند دینے سے خدشہ ہے کہ یہ دو گروہ مستقل نہ ہو جائیں۔ ابھی سے بعض موقع شناس مہاجرین کے مفاد کے تحفظ کی آڑ میں اپنی انتخابی مہم کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اگر تالیف قلوب سے مہاجرین کو مکمل پاکستانی بنا لیا جاتا تو آج یہ خطرناک تقسیم اپنی طبعی موت مر چکی ہوتی۔ سابقہ اسمبلی میں زمینداروں، مزدوروں وغیرہ کی جو مخصوص نشستیں ہوا کرتی تھیں ان کو ختم کر دیا گیا ہے، البتہ یونیورسٹی کی خصوصی نشست باقی رکھ لی گئی ہے۔

نہروں کا پانی نہروں کے پانی کی تقسیم بالخصوص سلیمانکی نہری سرچشمہ کی ملکیت سے متعلق ہندوستان نے جو تعطل پیدا کر رکھا ہے اس ضمن میں پاکستان نے آخری تجویز پیش کی ہے کہ جو کمیشن سویڈن کے جج کی صدارت میں مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال اور آسام کے مابین سرحدی تنازعات کا تصفیہ کرنے کے لئے مرتب ہوگا سلیمانکی کی ملکیت کا سوال بھی اس کے روبرو پیش کیا جائے۔ ریڈکلف کے فیصلہ کی رو سے یہ علاقہ پاکستان کے حصہ میں آیا تھا لیکن حد فاصل کھینچتے وقت یہ حصہ ہندوستان کی طرف چلا گیا۔ فیصلہ مذکورہ میں ضرورت کے مطابق حد فاصل میں تبدیلی کی گنجائش تھی۔

"جہنم ارضی" ہندوستان نے "تارکین وطن کی جائدادوں سے متعلق جو آرڈیننس نافذ کیا ہے اس کے نفاذ سے متعلق روزنامہ "ہند" (جس کے ڈائرکٹروں میں ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں) لکھتا ہے:

آرڈیننس کا نفاذ ہوتے ہی ہندو حکام نے جوش و خروش سے مسلمانوں کی جائدادوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے نہ صرف ان مسلمانوں کی جائدادوں کو قبضہ میں لیا جو پاکستان چلے گئے تھے بلکہ ایسے مسلمانوں کی جائدادیں بھی قبضہ میں کر لی گئیں جو کام کاج کے سلسلہ میں اپنے گاؤں سے شہر گئے ہوئے تھے بلکہ بعض ایسے بھی تھے جو اسی گاؤں یا شہر میں تھے مگر موقع پر اپنے گھر میں موجود نہیں تھے۔ کوئی عقلمند اس ناانصافی کو جائز نہیں قرار دے سکتا۔ ہم ماتحت حکام کی ان بدعنوانیوں پر حکومت ہندوستان کو ملزم قرار دیتے ہیں کیونکہ اگر حکومت کی طرف سے واضح ہدایات جاری کر دی جائیں تو یوں جہنم کے دروازے نہ کھل جاتے۔

جے پرکاش نارائن نے ۱۰ اکتوبر کو بمبئی میں کہا:

مسلمانوں کی ۹۹ فیصدی آبادی کانگریس کے خلاف ہے لیکن مسلمانوں کو اس حد تک خوفزدہ اور بے احساس کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق عمل نہیں کر سکتے۔ وہ کانگریس کو ڈر کے مارے ووٹ دیتے ہیں کیونکہ کانگریسی امیدوار کان اسمبلی اور سرکاری حکام ان پر دباؤ ڈالتے ہیں۔

سکھوں کی حالت

ہندوؤں نے تقسیم ہند سے پیشتر اپنی مطلب براری کے لئے جس طرح سکھوں کو آلۂ کار بنایا اور مسلمانوں کے خلاف صف آرا کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ ان کی پیدا کردہ فضا سے ایسا معلوم دیتا تھا کہ ہندو اور سکھ یکجا ہو گئے تو بالکل امن و امان ہو جائے گا۔ اور دونوں فرقے یک جان و دو قالب بن کر رہیں گے۔ چنانچہ سکھوں نے اس دام تزویر میں آ کر تدبر و سیاست کی پوری قربانی دی اور پنجاب کو تقسیم کرانے اور اپنا "قومی وطن" بنانے پر تل گئے۔ سکھستان بالآخر سبز باغ ثابت ہوا اور اب سکھ محسوس کر رہے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے لاہور فتح کرنے اور مسلمانوں کو بزور شمشیر پنجاب سے نکال دینے کا جو خواب دیکھا تھا اس کی "تعبیر" کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

سکھوں کا اردو روزنامہ رنجیت نگارہ (نئی دہلی) ۲۰ ستمبر کی اشاعت میں گذشتہ دو سالہ کوائف کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

سکھوں نے جنگ آزادی میں زیادہ سے زیادہ آدمی جیلوں میں بھیجے اور تختۂ دار پر لٹکوائے۔ انھوں نے انقلاب ۱۹۴۷ء میں جان، مال اور آبرو کی سب سے بڑھ کر قربانی کی۔ بالآخر انھیں کو سب سے بڑی سیاسی شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ سکھ خواب دیکھ رہے تھے کہ تقسیم پنجاب سے وہ مشرقی پنجاب کے حکمران بن جائیں گے۔ ان کا یہ خواب پریشاں ہو چکا ہے۔ اب انھیں معلوم ہوا ہے کہ وہ دوسروں کے آلۂ کار ہیں۔ وہ مسلمانوں سے انتقام لیتے لیتے ایک کہیں گہری فرقہ داریت کا شکار ہو گئے۔ اس فرقہ داری کے طوفان میں ان کے لئے اپنی ہستی برقرار رکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔ سکھ ہندوؤں کے

پنجۂ استبداد میں ہیں۔ ہندو جمہوریت میں سروں کو گنا جاتا ہے اور گدھوں، بیوقوفوں اور بزدلوں کی حقیر اکثریت شیروں، داناؤں اور بہادروں کی اقلیت سے اطاعت و انقیاد کا مطالبہ کرتی ہے۔ جس قوم کیلئے سکھوں نے اتنا کچھ کیا آج وہی سکھوں کے کلچر، زبان اور بقا کیلئے خطرہ بن گئی ہے۔

ماسٹر تارا سنگھ کو جسے حکومت نے ۱۹ فروری کو حراست میں لیا تھا، ۴ اکتوبر کو رہا کر دیا گیا ہے۔ ۱۱ اکتوبر کو امرتسر میں تارا سنگھ نے کہا کہ میں پہلے سے بھی زیادہ شدت سے سکھوں کے مطالبات پیش کروں گا خصوصیت سے پنجابی زبان کے علیحدہ صوبے کے قیام پر زور دوں گا۔

نہرو کا عزمِ امریکہ

۱۰ اکتوبر کو نہرو بعزمِ امریکہ لندن پہنچا۔ پہلے پروگرام کے مطابق نہرو کو یہ سفر وسط اکتوبر میں اختیار کرنا چاہیے تھا۔ اس عجلت کو ہندوستان کی مالی و اقتصادی پریشانیوں سے متعلق کر کے بعض حلقوں میں خصوصی اہمیت دی جا رہی ہے۔

امریکہ پہنچ کر نہرو نے ۱۳ اکتوبر کو امریکی کانگرس کو خطاب کیا۔ اپنی امن پسندی کا ڈھنڈورہ پیٹ کر انسانی آزادی کو ہر خطۂ ارض پر بچانے کا دعویٰ باندھا نیز اس امر پر بھی زور دیا کہ ہندوستان کو صنعتی اور فنی امداد کی ضرورت ہے۔ بعض برطانوی مبصرین کا خیال ہے کہ نہرو کے ان دعووں کے باوجود کہ وہ مشرق و مغرب کے متخالف گروہوں میں سے کسی کا ساتھ نہ دے گا، وہ امریکہ سے جب لوٹے گا تو خلاف کمیونسٹ محاذ سے متعلق حتمی عہد و پیمان کر آیا ہوگا۔ ایسا عہد و پیمان بعید از قیاس نہیں۔ چین کے بعد امریکہ کو ہندوستان کی ضرورت ہے اور ہندوستان کو گوناگوں مالی اور اقتصادی مصائب سے گلوخلاصی کرانے کیلئے امریکہ کی ضرورت ہے۔ امریکہ کا ہندوستان کو حفاظتی کونسل کا رکن بنا دینا ہی اغراض و مفادات کے گٹھ بندھن کا اہم قدم ہے۔

سنگھ اور کانگرس

سابقہ ممنوع اور بقول نہرو حکومت پر زبردستی قبضہ جمانے کی متمنی جماعت راشٹریہ سیوک سنگھ کے لئے ملک کی برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی یعنی کانگرس نے اپنی آغوشِ محبت اس "سابقہ" فسطائی جماعت کے لئے وا کر دی ہے۔ کانگرس کی مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا ہے کہ سنگھ کے رکن بھی کانگرس کے رکن بن سکتے ہیں۔

جے پرکاش نرائن، جنرل سکرٹری، سوشلسٹ پارٹی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۰ اکتوبر کو کہا کہ اسے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کانگرس اسقدر گر جائیگی اور زمانہ ساز اور بے اصول بن جائے گی۔

مدراس کی حکومت نے ۲۶ ستمبر کے ایک اعلان میں کمیونسٹ پارٹی کو صوبہ بھر میں خلاف قانون قرار دیدیا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی اس سے پیشتر کوئی سال بھر سے مغربی بنگال میں خلاف قانون چلی آ رہی ہے۔ ہندوستان کی حکومت یہ اعلان کرتی رہتی ہے کہ ہندوستان میں کمیونسٹ خطرہ قابل ذکر نہیں، اس کے باوجود یہ پارٹی دو صوبوں میں خلاف قانون قرار دی جا چکی ہے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ سے جھک کر صلح کرنے سے ہی اندازہ

لگایا گیا تھا کہ اب حکومت کمیونسٹوں پر سختی کرے گی۔ لیکن حکومت کی سختی کے باوجود کمیونسٹ شورش، افزوں تر ہوتی جا رہی ہے۔ اگر ہندوستان کا خیال ہے کہ وہ قوت کے بل بوتے پر کمیونسٹ پارٹی کو دبا سکتا ہے تو یہ خیال خام ہے۔ جب تک اقتصادی حالات بگڑتے رہیں گے، کمیونسٹ تشدد سے نہیں دبائے جا سکیں گے

سائرانیکا جولائی میں امیر سنوسی اور برطانوی وزارت خارجہ کے مابین لندن میں مذاکرات ہوئے اور طے پایا کہ امیر موصوف سائرانیکا کی حکومت کے داخلی نظم و نسق سے متعلق آئین مرتب کرلے۔

امیر سنوسی نے باقاعدہ طور پر ۸ ستمبر کو آئین کا نفاذ کر دیا اور ڈھائی لاکھ کے قریب سنوسی عربوں کی حکومت سائرانیکا کو آزاد حکومت کا درجہ دلا دیا۔

بیون۔ سفارزا " معاہدہ " کی ناکامی کے بعد برطانیہ جنرل اسمبلی کے حالیہ اجلاس سے پیشتر برطانیہ یہ دوسری چال چلا ہے۔ امیر کو آئین مرتب کرنے کا حق دیئے جانے کا اعلان جو ہوا تو دو دنوں میں امیر نے آئین مرتب کر لیا اور اگلے دن اس کا نفاذ کر دیا۔ ماسکو سے بہت پہلے پیشین گوئی ہوئی تھی کہ برطانیہ اقوام متحدہ کو دھوکا دے کر لیبیا میں اپنے عزائم استعماریت کو بروئے کار لا رہا ہے۔ یہ اندازہ غلط معلوم نہیں ہوتا!

۱۲ اکتوبر کو اقوام متحدہ کی سیاسی کمیٹی نے اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ لیبیا کو فوری طور پر آزاد کر دیا جائے۔ آزادی کی تاریخ کا تعین ابھی تک نہیں ہو سکا۔ اس سب کمیٹی نے ۱۴ اکتوبر کو ایک کمشنر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا جو لیبیا کے حصول آزادی کی نگرانی کرے گا۔ حصول آزادی تک کمشنر کی ایک مشاورتی کونسل ہوگی۔ یہ کونسل برطانیہ، امریکہ، فرانس، مصر، اٹلی اور پاکستان پر مشتمل ہوگی۔ ان فیصلوں کے لئے سیاسی کمیٹی کی تصدیق کی ضرورت ہے۔

اطالوی شمالی لینڈ سے متعلق ۱۷ اکتوبر کو فیصلہ ہوا کہ اسے دس سال کے بعد آزادی دی جائیگی بشرطیکہ اس وقت جنرل اسمبلی اس سے مختلف فیصلہ نہ دیدے۔ اس اثنا میں اس علاقہ کو تولیت میں رکھا جائیگا۔

عربی سیاست شام میں حسنی الزعیم کے قتل اور دوسرے انقلاب کے ظہور کے نتائج اب واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ الزعیم کے برسر اقتدار آنے پر متعلقہ حلقوں میں توقعات بندھ چلی تھیں کہ شام کلاں کا خواب بالآخر معرض تعبیر میں آجائیگا۔ لیکن واقعات کی رفتار کا رخ بدل گیا اور یہ توقعات خام ثابت ہوئیں۔ اب حناوی کے انقلاب سے پھر متعلقہ حلقے سرگرم اور بااُمید نظر آنے لگے ہیں اور شام کلاں کا چرچا عام ہونے لگا ہے۔ مصر کے باخبر سیاسی حلقوں کا قیاس ہے کہ اردن، عراق، شام، لبنان کا مسلم علاقہ اور فلسطین کا عربی علاقہ خلاف توقع بہت جلد ایک وحدت میں منسلک ہو جائیں گے۔ عراق اور شام کے " عوام " اس وحدت کے حق میں نظر آتے ہیں، شام کی بعض سیاسی پارٹیاں بھی اس وحدت کی مؤید ہو گئی ہیں۔ شامی وزیراعظم نے عراقی ریجنٹ سے حالیہ ملاقات میں جمہور شام کی ان خواہشات کو اس تک

پہنچایا۔ شام کے وزیر تعلیم نے اس کی یوں تائید کی:

عراق اور شام کی وحدت دونوں ممالک کے عوام کی دیرینہ خواہش ہے۔ کرنل حناوی نے بھی اس وحدت کو قوت کہہ کر اس کے استقبال کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ جنرل اسمبلی (اقوام متحدہ) کے شامی مندوب الخوری نے عربی نمائندوں کے سامنے اس دعوت کی حمایت کی جس سے اندازہ کیا جا رہا ہے کہ وہ عربی نمائندوں کی وحدت کے حق میں تائید حاصل کر رہا ہے۔

عوام اس وحدت کو کس حد تک پسند کرتے ہیں اور اس سے کیا فوائد مرتب ہو سکتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب قدرے مشکل ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ شاہ عبداللہ اپنی حقیری سلطنت کو وسیع کر کے عربی ممالک میں توازن قوی اپنے حق میں بدلنا چاہتا ہے۔ اب تک عربی سیاست میں باعتبار عظمت سلطنت واہمیت مصر کی حیثیت نمایاں رہی۔ عبداللہ اسی حیثیت کو بدلنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصر اس اقدام کو جمعیت خاطر سے نہیں دیکھ سکتا۔ عراق اور اردن اس سلسلہ میں نمایاں تگ و دو کر رہے ہیں۔ نوری السعید اور شاہ عبداللہ کے حالیہ دورے اسی نکتہ کی تفسیر ہیں۔ یہ مجوزہ وحدت عام حالات میں تو خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے کی ضامن ہو سکتی ہے لیکن جس باہمی منافرت اور رقابت پر اس کی اساس رکھی جا رہی ہے اس کا نتیجہ افتراق و فساد ہی ہو سکتا ہے۔ ایسے میں یہ وحدت دول عظمیٰ کی سیاست قوت کے سامنے گوئے بازی بن کے رہ جائے گی۔

عرب لیگ کونسل کا اجلاس بالآخر ۱۰ر اکتوبر کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت شامی مندوب نے کی۔ شام، عراق اور اردن کی مجوزہ وحدت کے سوال پر بحث و تمحیص کی گئی اور تمہیدی تقریروں کے بعد اجلاس ۱۹ر اکتوبر تک ملتوی ہو گیا۔

ایران ۹ر اکتوبر کو طہران میں سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ شاہ ایران امریکہ سے واپسی پر حکومت پاکستان کی دعوت پر پاکستان کا دورہ کریں گے۔ ۱۰ر اکتوبر کو کراچی سے اعلان ہوا کہ حکومت پاکستان کی دعوت پر شاہ ایران موسم سرما میں پاکستان کا سرکاری دورہ کریں گے۔ دورہ کی تاریخ اور دیگر تفصیلات کا اعلان بر وقت کر دیا جائیگا۔

افغانستان ظاہر شاہ ۷ر اکتوبر کو مرض چشم کے علاج کے لئے عازم برطانیہ ہوا۔ توقع ہے کہ شاہ طویل عرصہ کے لئے ملک سے غیر حاضر رہے گا۔ ابھی ایام میں ہنر وانگلستان سے ہوتا ہوا امریکہ پہنچا ہے۔ باخبر حلقوں میں اس اتفاق کو خصوصی اہمیت دی جا رہی ہے۔

انڈونیشیا ہیگ میں ہالینڈ اور انڈونیشیا کے نمائندوں کی جو گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی ہے ہر چند اس کی کامیابی کے امکانات روشن بتلائے جا رہے ہیں لیکن انتقال اقتدار کی جو

آخری تاریخ یعنی جنوری ۱۹۵۰ء مقرر کی گئی تھی اس تک اس بیل کا منڈھے چڑھنا قرین قیاس نظر نہیں آتا۔ ہالینڈ تصفیہ کو متاخر کرتا جا رہا ہے اور سیاسی اور اقتصادی آزادی کو بے اثر بنانے کے لئے مداخلت کی صورتیں نکال رہا ہے۔

انڈونیشیا کے نمائندے لیمرٹس این پالر نے جنرل اسمبلی میں (۲۷ ستمبر) کہا کہ ہالینڈ اقتصادی حربوں سے انڈونیشیا پر اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جمہوریہ انڈونیشیا ایسے اقدامات کو مسترد کر دے گی۔ پالر نے مزید کہا کہ اگر مذاکرات ہیگ ناکام ہو گئے تو انڈونیشی معاملہ کو جنرل اسمبلی میں پیش کر دیا جائے گا۔

انڈونیشیا نے مذاکرات مکمل کرنے کے لئے دو ماہ کا جو عرصہ مقرر کیا تھا وہ ۲۳ اکتوبر کو ختم ہو جائے گا اور خیال کیا جاتا ہے کہ انڈونیشی نمائندے اس مدت میں توسیع گوارا نہیں کریں گے بلکہ وہ واپس آجائیں گے اور اقوام متحدہ میں سارا معاملہ پیش کر دیں گے۔

اس دوران میں انڈونیشی افواج میں اضطراب بڑھتا جا رہا ہے اور ڈر ہے کہ فوج بے قابو ہو کر ایسا اقدام نہ کر گزرے جس سے ہیگ گول میز کانفرنس پر زد پڑے۔ مئی کے معاہدہ التوائے جنگ کی رو سے ہالینڈ نے التوائے جنگ کے بعد انڈونیشی افواج کو ضروری رسد پہنچانے کی ذمہ داری لی تھی۔ یہ رسد ابھی تک فوجوں کو نہیں پہنچائی گئی۔

ایٹم بم صدر ٹرومین نے ۲۳ ستمبر کو یہ انکشاف کیا کہ گذشتہ چند ہفتوں میں روسی علاقہ میں ایٹمی دھماکا ہوا ہے۔ لندن اور اوٹاوہ (کینیڈا) سے بھی ایسے ہی اعلانات ہوئے ہیں لیکن ضروری تفصیلات کہیں سے بھی شائع نہیں ہوئیں۔

روس کی سرکاری خبر رساں ایجنسی نے ۲۵ ستمبر کو اس انکشاف پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ جہاں تک ایٹم بم کا تعلق ہے، روس اس کا راز ۱۹۴۷ء سے جانتا ہے۔ نیز ایٹمی حربے بھی روس کے پاس موجود ہیں۔ لیکن اس سے دوسرے ممالک کو گھبراہٹ نہیں ہونی چاہئے کیونکہ روس ان حربوں کا مالک ہونے کے باوصف بدستور سابق اسی حکمت عملی پر کاربند رہنا چاہتا ہے کہ ایٹمی حربوں کا استعمال کلیتہً ممنوع قرار دیا جائے۔

برطانیہ ۲۴ ستمبر کو مال پارٹی کے ایک علاقائی اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے اٹیلی، وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ آئندہ نو مہینوں میں انتخابات عامہ منعقد ہو جائیں گے اور اس وقت ملک یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ موجودہ جمہوری، اشتراکی نظام حکومت کو جاری رکھے گا یا سرمایہ داری کی لعنتوں اور ناانصافیوں کو اس پر ترجیح دے گا۔ ۱۳ اکتوبر کو اٹیلی نے اعلان کیا کہ انتخابات

۱۹۴۹ء میں نہیں ہوں گے۔

سٹرلنگ کی عدم تخفیف کا مسئلہ پارلیمان کے خصوصی اجلاس میں پیش ہوا جو حزبِ خلاف کے خصوصی مطالبہ پر ۲۷ ستمبر کو تین دن کے لئے شروع ہوا۔ حکومت کی طرف سے جو تحریک پیش ہوئی اس کا مدعا حکومت پر کامل اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا تھا۔ چرچل نے اس میں ترمیم پیش کر کے اس حقیقت پر اظہارِ افسوس کرنا چاہا کہ حکومت کی چار سال کی متواتر مالی بدنظمی کا نتیجہ تخفیف شرحِ تبادلہ کی صورت میں نکلا ہے، اور یہ کچھ کرپس کی تسلیوں اور ضمانتوں کے باوجود ہوا ہے۔ اپنی تقریر میں چرچل نے تخفیف اور روس کی ایٹم بنانے میں کامیابی کو برطانیہ کے لئے کڑا موقع قرار دیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ عوام سے اپیل (یعنی انتخاباتِ نو) اور نئی پارلیمان ہی بڑھتی ہوئی کشیدگی کا مداوا ہو سکتے ہیں۔

چرچل کی ترمیم جسے حکومت کی مذمت پر محمول کیا جا رہا تھا بالآخر نامنظور ہو گئی۔

چین 'سرخ' چین کے قائد ماؤ تسی تنگ نے ۲۱ ستمبر کو جمہوریہ چین کی تشکیل کر دی جس کا صدر مقام پائی پنگ ہے۔ ۳۰ ستمبر کو جمہوریہ چین کی عوامی حکومت کا صدر متفقہ طور پر ماؤ تسی تنگ کو چنا گیا۔

۲ اکتوبر کو اس حکومت نے ممالکِ غیر سے اپیل کی کہ وہ کمیونسٹ چین کو تسلیم کر لیں۔ ۳ اکتوبر کو روس نے اس حکومت کو تسلیم کر لیا اور "قومی چینی حکومت" سے تعلقات منقطع کر لئے۔ چین کی کمیونسٹ حکومت نے ۲۹ ستمبر کو فیصلہ کیا کہ وہ نیشنلسٹ چین کے مندوبین اقوامِ متحدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے۔

چین کے کمیونسٹ ریڈیو نے اس الزام کو پھر سے دہرانا شروع کر دیا ہے کہ برطانیہ، امریکہ اور ہندوستان تبت کا الحاق کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے ریڈیو نے کہا کہ ہندوستان کی سرکاری خبر رساں ایجنسی نے ۲۷ جولائی کو کہا کہ تبت نے کبھی چین کی حاکمیت تسلیم نہیں کی۔ اسی دن برطانوی حلقوں نے بیان دیا کہ اگر چین نے تبت پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش کی تو تبت برطانوی مداخلت کی درخواست کر سکتا ہے۔ ریڈیو نے نہرو کے متعلق کہا کہ اس نے اپنے آدمی تبت کے دارالحکومت لاسہ میں بھیجے تاکہ وہ تبت کے الحاق کی تجویز کو مکمل کریں۔

سنکیانگ نے کہ چین کا آخری شمال مغربی صوبہ ہے، کمیونسٹ چین سے الحاق کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سنکیانگ نے اس سال کے آغاز میں چیانگ کائی شیک کے چین سے قطع تعلق کر لیا تھا اور اپنے آپ کو خود مختار قرار دے لیا تھا۔ سنکیانگ کی سرحدیں تبت، روسی ترکستان، افغانستان اور منگولیا نک سے جا ملتی ہیں۔

کمیونسٹوں نے کینٹن پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔

امریکہ اور برطانیہ سوچ رہے ہیں کہ سرخ چین کو تسلیم کرنے کا کونسا موزوں موقع ہوگا۔ چین کے کمیونسٹ ہو جانے اور اسے روس کے تسلیم کر لینے سے ایشیا میں قوتوں کا توازن بدل کر روس کے حق میں ہوگیا ہے۔ اس انقلاب عظیم کا اثر لامحالہ برما، ملایا، ہندچینی وغیرہ پر پڑے گا۔ چنانچہ اس بدلی ہوئی صورت حال کا جائزہ لینے اور اپنی حکمت عملی کو اس کے مطابق کرنے کے لئے برطانیہ کے مدبرین اور نمائندگان کا ایک اہم اجتماع جنوب مشرقی ایشیا میں نومبر میں ہو رہا ہے۔

برما

"چار لاکھ کیرن قبائل جس علیحدہ سٹیٹ کے لئے گذشتہ آٹھ مہینوں سے لڑ رہے تھے پایۂ تکمیل تک پہنچ چکی ہے" یہ دعویٰ سا پایا ماگی نے اپنے صدر مقام ٹونگو (وسطی برما) سے ۲۸ ستمبر کو کیا۔

دولت مشترکہ کے چار ممالک (برطانیہ، سیلون، پاکستان، ہندوستان) کے باہمی مذاکرات چار ماہ کے بعد پھر شروع ہو گئے ہیں۔ ان مذاکرات میں یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ برما کو کس شکل میں مالی اور فوجی امداد دی جائے تاکہ وہ موجودہ مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکے۔ ان چار مہینوں کے دوران میں رنگون میں متعین برطانوی سفیر لندن جا کر حکومت سے ضروری مشورے کر آیا ہے۔ اس کے علاوہ او ای ٹونگ، برما کا وزیر خارجہ امریکہ اور برطانیہ کا دورہ کر کے ہر دو حکومتوں کے قائدین سے ملاقات کر آیا ہے۔

بوقلمونیاں

لئے غریب سے چندے میں چند آنے بھی
ضیافتِ اُمرا میں لُٹے خزانے بھی

تمام قوم کی صحت کا بھی خیال رہا
سِنیما بنا سپتی گھی کے کارخانے بھی

حقیر و پست بھی جانیں ہم ان کے کلچر کو
اُنہی کے فلم ہوں رائج اُنہی کے گانے بھی

اُٹھے حجابِ زناں اور دلوائیں نہ رہیں!
کہیں سُنے بھی ہیں ہم اور کہیں پرانے بھی

نظر فروز ہیں جلوے جو عصرِ حاضر کے
تو دلفریب ہیں گزرے ہوئے زمانے بھی

جو دینِ حق کے محاسن کا اعتراف ہوا
تو مصلحت کے تراشے گئے بہانے بھی

درِ حرم کا تو سجدہ ہے ناگزیر مگر
جبیں نواز ہیں کچھ اور آستانے بھی

لگے ہوئے تو ہیں محنت میں رات دن لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ محنت لگے ٹھکانے بھی

غضب یہ ہے کہ ابھی تک نہ ہم کو ہوش آیا
پڑے اگرچہ حوادث کے تازیانے بھی

وہ جس نے خاص عنایات سے نوازا ہے
عجب ہے کیا جو لگے ہم کو آزمانے بھی

اسدؔ بتوں کی وفا کا تو رنگ دیکھ لیا
کہاں پناہ جو ٹھکرا دیا خدا نے بھی

اسعد ملتانی

(بقیہ لمعات)

ہم مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ قوم کی صحت دن بدن نیچے گرتی چلی جا رہی ہے اور ان کی توانائی روز بروز سلب ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اربابِ حل و عقد کو اس کا کچھ خیال نہیں۔ اس لئے ہم حیران ہیں کہ ایک دو نسلوں کے بعد اس قوم کا حشر کیا ہوگا! مشرقی پنجاب میں ستمبر، اکتوبر کے مہینوں میں عام طور پر ملیریا کی شکایت وبائی صورت اختیار کر لیا کرتی تھی۔ یہ وہاں ہر سال کا معمول ہو چکا تھا۔ لیکن وہاں کے زمینداروں (کاشتکاروں) میں اتنی توانائی ہوتی تھی کہ وہ اس بخار کو مرض ہی نہیں گردانا کرتے تھے۔ بخار چڑھ رہا ہے اور ہل جُت رہا ہے۔ جاڑے نے زیادہ ستایا تو ہل چھوڑ کر جا دڑا پکڑ لیا اور جب تک جسم پسینے سے تربتر نہ ہوگیا اسے ہاتھ سے چھوڑا نہیں۔ اب اسی مشرقی پنجاب کے بقیۃ السیف ستم رسیدہ، بخت سوختہ زمیندار (کاشتکار) مغربی پنجاب کے دیہات میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ یہ وہی تنومند زمیندار ہیں اور وہی کاتک کے بخار۔ لیکن حالیہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو کسی گاؤں میں کوئی شخص بخار سے نہیں بچا اور دوسرے یہ کہ اسی بخار سے، جسے یہ کبھی خاطر میں ہی نہیں لایا کرتے تھے، مسلسل اموات ہو رہی ہیں اور شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں صفِ ماتم نہ بچھ رہی ہو۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ یہ بدنصیب مسلمان جن حالات میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اس کے بعد جس کس مپرسی کے عالم میں یہاں اپنے متعینہ "سانس" پورے کر رہے ہیں۔ اس نے ان کی توانائی کو یکسر چوس لیا ہے اور اب وہی تنومند طبقہ، جو کبھی قوم کی "ریڑھ کی ہڈی" کہلاتا تھا، دیمک خوردہ لکڑی کا ستون بن چکا ہے۔ طاقت اور توانائی پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد بصد مشکل جو خوراک میسر آتی ہے وہ تنورِ شکم کے ایندھن سے زیادہ کچھ نہ ہوتی۔ لہٰذا اب کے جو بخار کا حملہ ہوا تو خس و خاشاک کی طرح اس سیلاب میں بہہ گئے۔ اور کونین کی چند ٹکیوں کے نہ ملنے سے ہزاروں انسانی جانیں بے دریغ تلف ہو گئیں۔ اب وہاں ہر گھر سے نالہ و شیون کی دردناک صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ کمانے والے مر گئے ہیں اور بیواؤں اور یتیموں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ قوم پر یہ کچھ گذر رہی ہے اور قوم کی حفاظت و بہبود کے اجارہ دار، یا تو نئی الاٹ شدہ ملوں، فیکٹریوں اور جائدادوں کے الٹ پھیر میں مصروفِ تگ و تاز ہیں اور یا پھر وزارتوں اور ممبریوں کی دھن میں الیکشن بازیوں اور پارٹی سازیوں کے "جہادِ عظیم" میں مشغول۔ ان کمبختوں کو

زیادہ نہیں تو قوم کی حفاظت کا اتنا ہی فکر ہونا چاہیئے جتنا قصاب کو اپنی بکریوں کا خیال رہتا ہے۔ انہیں اتنی سوچ بھی تو نہیں کہ اگر قوم اس طرح سے سسک سسک کر ختم ہو گئی تو پھر یہ کس کے خون پر موٹے ہوں گے؟ یہ تو فرعون سے بھی گئے گذرے ہو گئے کہ اسے بنی اسرائیل کی پرورش (ربوبیت) کا خیال تو رہتا تھا۔ انہیں اپنے ذاتی دھندوں اور سیاسی روباہ بازیوں سے اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ خود اپنے مستقبل کے مفاد کی بابت ہی کچھ سوچ سکیں۔ اب ہم کس سے جا کر کہیں کہ

انز باغباں شد است کہ صیاد آں نکرد

اربابِ نظم و نسق کی بے حسی کا یہ عالم ہے۔ راہنمایانِ ملت کی شقاوتِ قلبی کی یہ کیفیت۔ اس کس مپرسی اور بے چارگی کی حالت میں، بیکس و بے بس انسانوں کا یہ ہجوم، رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھتا اور ایک آہ سرد بھر کر بصد حسرت و یاس انتہائی خاموشی سے پوچھتا ہے

کہ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

کتاب لمیٹڈ

کا

اعلان

کتاب لمیٹڈ کا رجسٹریشن سارٹیفکیٹ گورنمنٹ کی طرف سے حاصل کیا گیا ہے۔

اب ہم بہترین پیمانے پر بہترین لٹریچر کی اشاعت کریں گے۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ کتابوں کے کاروبار میں اچھا منافع ہوتا ہے بشرطیکہ محنت اور دیانت سے کام لیا جائے۔ محنت اور دیانت کی ہم آپ کو ضمانت دیتے ہیں۔

آج ہر شخص محسوس کر رہا ہے کہ بازاری لٹریچر کو جو ملت کی تباہی کا موجب ہے ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ ایسا لٹریچر مہیا کیا جائے جس سے افرادِ ملت کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح خطوط پر ہو۔ یہ اہم سوال ہمارے سامنے ہے اور ایسا ہی لٹریچر ہمارے پروگرام میں شامل ہے۔

کتاب لمیٹڈ کے ایک حصہ کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے جو سال بھر میں چار قسطوں میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ آپ جس قدر جلد حصص خرید کر روپیہ فراہم کریں گے ہم اسی قدر جلد کام شروع کر سکیں گے۔ کتاب لمیٹڈ جہاں آپ کو عمدہ منافع دیگی وہاں مفید کاروبار کو ترقی دیکر مفید لٹریچر بھی پیش کریگی۔ آپ کا یہ تعاون قومی علاوہ ذاتی منافع کے قومی مفاد کو بھی آگے بڑھائے گا۔ اگر آپ اس کاروبار کو مفید سمجھیں تو درخواست اور قواعد کی کاپی حاصل کرنے کیلئے ۲/ ارسال فرمائیں۔

آپ کا مخلص

جے۔ بی۔ عارف

مینیجنگ ڈائرکٹر۔ کتاب لمیٹڈ

معرفت:۔ دفتر طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی